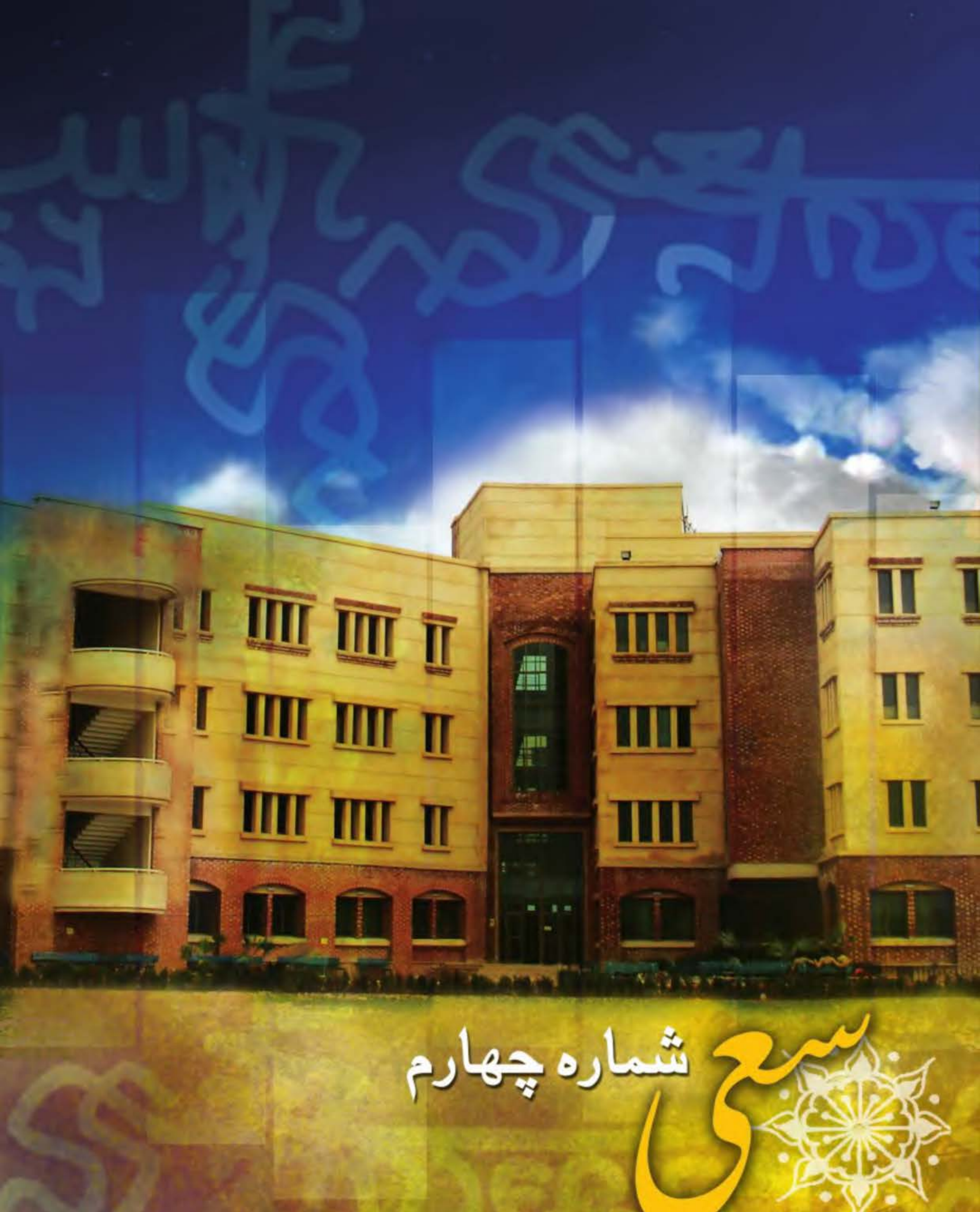


سعی

شمارہ چہارم

کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد

تقریبِ تقسیمِ اسناد (18th Convocation) ۲۰۰۹ء











کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی

اسلام آباد

سعی

شمارۂ چہارم

ciitmagazine@comsats.edu.pk

www.ciit.edu.pk

مجلسِ نگران

سرپرستِ اعلیٰ :	جناب ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی، (ستارۂ امتیاز)
پرووسٹ (Provost):	جناب ڈاکٹر قیصر عباس
سرپرست:	جناب ڈاکٹر قیصر عباس
نگرانِ اعلیٰ :	جناب مظہر حبیب
نگران:	محترمہ گلشن زہرہ
	جناب مہدی عباس
تکنیکی نگران:	جناب ذوالقرنین جعفری
	جناب منصور شوکت
مدیرِ اعلیٰ :	سید نبیل حسن
نائب مدیرِ اعلیٰ :	محمد رضا سرگانہ
مدیران:	راجہ محمد حسیب
	کنول رانی
	مبشر احسن
گرافک ڈیزائنر :	مبشر احسن

کمپوزنگ: محمد وسیم اعوان



سربراہِ ادارہ کا پیغام

اظہار کے پیرائے مزاجوں کی مانند انگنت ہوا کرتے ہیں۔ اظہار رنگوں میں گُھل جائے تو فنکار کے ہاتھ تصویر تخلیق کرتے ہیں۔ اظہار اصبات میں سمو جائے تو سات سُروں کو ساگر پر سنگیت کے بادبان کھولتا ہے۔ اگر وہی اظہار لفظوں کی تسبیح میں پرو دیا جائے تو شاعری اور ادب تشکیل پانے لگتے ہیں۔ دُنیائے فن بُہت بسیط ہے اور صحرائے اظہار کے اس قریہ کی تخلیق مُقلم اور تکلم سے ہے اور تکلم ذات میں دبے ہوئے اور زبان کے نیچے چھپے ہوئے انسان کا پیامبر ہوتا ہے۔ ''سعی'' کا چوتھا تکلم آپ کے پیرایہء فن کی نظر ہے۔ صفحات پر مشتمل یہ کاوش کامسیٹس کے طلباء و طالبات کے انکشافِ ذات کے لیے ناکافی سہی مگر تخمینے کے لیے غنیمت ضرور ہے اور کامسیٹس کے طلباء و طالبات کے قلم و ہاتھ کی گواہی کے لیے معتبر۔

''سعی'' کے چوتھے شمارے کی اشاعت پر میں مجلسِ ادارت کو مُبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ خُدائے لم یزل کی عطا سے زورِ قلم، ذوقِ گویائی اور طاقتِ خیالِ پرواز کو یکجائی ملتی رہے گی۔

ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی، ستارۂ امتیاز

ریکٹر

مجلسِ ادارت ''سعی'' سنہ ۲۰۰۸ء (اُردو سیکشن)



دائیں سے بائیں: سید تجمل حسن، جناب ذوالقرنین جعفری (تکنیکی نگران)، محترمہ گلشن زہرہ (نگران و کوآرڈینیٹر)، جناب ڈاکٹر قیصر عباس (پرووسٹ و سرپرست)، جناب مظہر حبیب (نگرانِ اعلیٰ)، جناب مہدی عباس (نگران)، محمد رضا سرگانہ

دائیں سے بائیں (کھڑے): راجہ محمد حبیب، کنول رانی، بشارت حسن



پرووسٹ (Provost) کا پیغام

خونِ جگر کو سینچ کر، بکھرے الفاظ کے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا، اور پھر مختلف لڑیوں کو ایک ساتھ باندھ کر معاشرے کے گلے کا گلوبند بنانے والے تخلیق کار کہلاتے ہیں۔ یہ وہ قوم ہے جو گھنے جنگل میں، گھری طوفانی رات میں بھٹکے راہی کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔ یہ طبقہ صنعتِ آئینہ سازی کی وجہ سے ہمیشہ زیرِ عتاب رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ منظرِ عام پر آنے سے گریز کرتے ہیں۔

مگر کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اپنے روزِ قیام سے نہ صرف ایسے ہیروں کو تراشتا رہا ہے، بلکہ ان کی مناسب حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''سعی'' کا چوتھا مُجلّہ آج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آج کے اِس سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں جہاں نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں، وہاں کتاب کی اہمیت بھی روز افزوں کم ہو رہی ہے۔ لوگ بھی ادب سے دور ہو رہے ہیں۔ مگر پھر بھی کامسیٹس، ''سعی'' کی شکل میں کتاب کی اہمیت کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہے اور ادب سے بھی لگاؤ کے رشتے کو قائم رکھے ہے۔ ریکٹر ایس ایم جنید زیدی (ستارہ امتیاز) کی زیرِ نگرانی جس طرح کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اس سرزمینِ پاک کو قائدِ اعظم اور اقبال کے افکار کے مطابق ترقی پذیر نہیں بلکہ ترقی یافتہ بنانے کے لئے کوشاں ہے، اِسی طرح اِس ادارے کا سالنامہ ''سعی'' بحرِ ادب میں شامل ہو کر اِسی معاشرے کو اندھیروں کی سرزمین ہونے سے بچانے کے لئے برسرِ پیکار ہے۔

یہ ادبی مجلّہ جہاں کامسیٹس، اس کی انتظامیہ اور مجلس ادارت ''سعی'' کی کامیابی کا مظہر ہے، وہاں اِس کی تمام مجلسِ ادارت مبارکباد کی بھی مستحق ہے، جس نے یونیورسٹی کے مصروف ترین معمولات میں سے وقت نکال کر اس کی اشاعت کو ممکن بنایا۔

میں امید کرتا ہوں کہ ''سعی'' کا یہ شمارہ آپ کی توقعات پر بھی پورا اترے گا اور آپ کی دلچسپی کے مشاغل میں بھی ایک اچھا اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر قیصر عباس

پرووسٹ (Provost)



مدیرِ اعلیٰ کا پیغام

ابتداءِ کلام ربّ الکلام کی حمد وثنا سے ہے کہ اِس کائنات کی ہر تصویر اور اُس میں موجود ہر رنگ اُسی خالقِ بزرگ و برتر کے وصفِ تخلیق کا نتیجہ ہے۔ غارِ حرا سے پھوٹتی ایک نہایت ہی مانوس اور اتنی ہی انجان صدا ارض وسماء کی وسعتوں میں پھیل کر انسان کو دعوتِ حمد دیتی ہے کہ عظیم نعمتِ حرف ولفظ نسلِ انسانی کو اِسی غار سے ملی ہے۔ اور وسیلۂ نعمتِ عظیم نبی محترم کریمؐ کی نعت بھی ہم پر واجب ہے کہ ان کے وجودِ پاک کے صدقے ہی تخلیقِ کائنات ہوئی۔

عزیزم! میں خاک نوردِ صحرائے فلسفہ نہیں لیکن زندگی کا سحر مجھے اِس پر سوچنے کو مجبور کرتا ہے۔ تصورات کے گلشن سے لے کر حقیقت کے پُرخار میدانوں تک سب کچھ محتاجِ زندگی ہے۔ زندگی کے معمے کو اُصولِ طبیعات نہیں سُلجھا سکتے۔ بعید الطبیعات خیالات اور ماورائے مادّہ کلیات کی مدد سے ہی اِس معمّے کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہر گزرنے والا دن زندگی کی کتاب پر رنج وراحت کے حاشیوں کے درمیاں ایک اور صفحہ تحریر کرتا جاتا ہے۔ زندگی کی یہی جادوئی سرشت اسے میرا پسندیدہ موضوع بناتی ہے۔ یہ ایک ایسے منشور (prism) کی طرح ہے جس پر مختلف زاویوں سے پڑنے والی روشنی نہایت ہی نیارے اور دلکش رنگ دکھاتی ہے۔ کہیں کہیں بدنمائی اور بے چارگی ضرور ہے پر مجھے یقین ہے کہ انسانیت مل کر اُس کو خوشنمائی اور خوبصورتی میں بدل سکتی ہے۔ زندگی میں جمود باعثِ ہتک ہے۔ زندگی تو وہ ہے جو ہر دم سرگرم، متحرک اور پیہم رواں دواں ہو۔ زندگی تو وہ ہے جس میں خوشی کے رنگ ہوں، جدوجہد کا ڈھنگ ہو۔ رشتوں کا احترام ہو، محبت کی چاشنی ہو، آنسو ہوں اور انہیں پونچھنے والے ہاتھ بھی۔ زندگی میں خوشی اور اطمینان جس قدر ایک احساس کا نام ہے اُس سے کہیں بڑھ کر ایک رویہ ہے۔ ہمیں اس رویہ کو اپنانے کی سعی کرنی چاہیے۔ ''سعی'' کا چوتھا قدم اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

لوحِ خیال پر لرزاں تحاریر کو سریر آراءِ ''سعی'' کرنے میں سب سے بڑا حصہ ریکٹر کامسیٹس جناب ایس ایم جنید زیدی کا ہے جنہوں نے ہمیں سپنے دیکھنے اور انہیں حقیقت کا پیرہن پہنانے کی ترغیب دی۔ بعدازاں ہماری فکر کی تشکیل و تزئین میں محترم قیصر عباس صاحب (پرووسٹ)، مظہر حبیب صاحب، محترمہ گلشن زہرا، مہدی عباس صاحب، ذوالقرنین جعفری صاحب اور منصور شوکت صاحب کا کردار ہے کہ جگنو سے راتوں کو دن کرنے کا سلیقہ ہم نے ان سے سیکھا۔ علاوہ ازیں میں اپنے والدین، اساتذہ، دوستوں اور رفقائے کارکا بھی ممنون ہوں جنکی پُرخلوص دعائیں ہمیشہ شاملِ حال رہیں۔ اِن سب کے علاوہ میں اُس شخص کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جو میری انابیبِ قلبی کے بہت قریب تھا، میرا عزیز دوست رانا محمد راشد قمر (مرحوم) جس کے ساتھ مل کر ہم نے بے آب وگیاہ صحرا میں سعی کا گلشن آباد کیا۔ اس کے ساتھ بتایا ہوا ایک ایک پل تادمِ حیات میرے دل ودماغ میں محفوظ رہے گا۔

ہم نے سعی میں انتخاب در انتخاب شعر ونثر کی ریزہ کاری کی ہے، اِس امید کے ساتھ کہ یہ آپ کے دل ودماغ میں جذبہ وخیال کی میناکاری کرتے رہیں گے۔ تفہیمِ زندگی کی طرف یہ چوتھا قدم آپ کی سوچ کے دریچوں پر دستک دینے میں کس حد تک کامیاب رہا؟ ضرور آگاہ کیجیے گا۔

سیّد نبیل حسن
مدیرِ اعلیٰ (بی بی اے-۸)
nabeel_h1@yahoo.com



اداریہ

گردشِ دوراں نے جب بھی مجھے بے بس کردیا اور لاچاری و یاس کے عالم میں جب تمام کاوشیں مسدود ہوتی رہیں، تو میرے دل کے کسی نہاں خانے میں موجود ربِ ذوالجلال اور حضور ﷺ کی محبت مجھے تقویت دیتی رہی اور اکثر و بیشتر رحیم و کریم نے حالات کو کچھ اس طرح سے مجبور کردیا کہ وہ مجھے اوجِ ثریا تک لے گئے۔

''سعی'' کے تیسرے شمارے کے منظرِ عام پر آنے کے ساتھ ہی نئی مجلس ادارت کو ان کی ذمہ داریاں تفویض کردی گئیں وہ بہت ہی مشکل لمحات تھے۔ کہنے والے بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی باتوں سے قطع نظر کرکے ''سعی'' کی مجلس ادارت نے اس مجلّے کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی ٹھانی۔ کافی تگ و دَو کے بعد خونِ جگر کی کشید، تحاریر کی صورت میں اکٹھی ہوئیں۔ تمام مدیران سید نبیل حسن، محمد رضا سرگانہ، مبشر احسن، راجہ حسیب اور کنول رانی نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حصہ اردو کی کاٹ چھانٹ کی۔ اس کی ڈیزائننگ کیلئے بھی مبشر نے کام کیا۔ فوٹو گرافی کا کام راجہ حسیب کے ذمہ تھا اور اب یہ مجلّہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ٹیم ورک، سخت محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ ہم نے اپنے تئیں اس مجلّے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے، امید کرتا ہوں کہ آپ کی محفل میں اسے پذیرائی ملے گی۔

اب میں اپنی ٹیم کی طرف سے مجلسِ ادارت اردو کے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے گاہے بگاہے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر ہمارے ساتھ تعاون بھی کیا اور ضرورت کے وقت مدد بھی۔ ان میں جناب ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی ریکٹر ادارہ، جناب ڈاکٹر قیصر عباس پرووسٹ، جناب مظہر حبیب انچارج میگزین، میڈم گلشن زہرہ کوآرڈینیٹر میگزین، جناب ذوالقرنین جعفری، اور جناب مہدی عباس اسسٹنٹ کوآرڈینیٹر میگزین شامل ہیں۔ دیگر اساتذہ کرام میں جناب خرم سلیم، انچارج ٹیلی کام، جناب تصور عباس اور جناب عاطف عبدالمجید، کا بھی میں خصوصی طور پر شکریہ ادا کروں گا۔

ان کے علاوہ چند دوست جنہوں نے وقت بے وقت ہماری ٹیم کی مدد کی۔ اگر ان کا تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو شاید یہ مجلّہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اِس طرح نہ ہوتا۔ ان میں سید شمس الحسن، فیضان، جنید عاطف، ماریہ، تاثیر، نوید، عمر، عاقل، نیہا، عثمان، مانی، مریم صدیقی، احمد ذیشان، محمد بلال، وقار، شامل ہیں۔

آخر میں میں ''سعی'' کے توسط سے سید عروج اختر (مدیرِ اعلیٰ، شمارہ ۲۰۰۶ء) اور رانا محمد راشد قمر (مدیرِ اعلیٰ، شمارہ ۲۰۰۷ء) کی محبت اور تعاون کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے دوست اور بڑا بھائی بن کر میری ہر ضرورت کے وقت مدد اور راہنمائی کی۔

جبکہ ہماری مجلس ادارت اس مجلّے کو اور اپنے کام کو مرحوم رانا محمد راشد قمر کے نام کرتی ہے جو اس سال حادثاتی طور پر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

محمد رضا سرگانہ
نائب مدیر اعلیٰ (بی ای ٹی۔٦)
msargana@yahoo.com

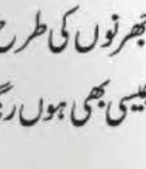
مجلسِ ادارت (حصہ اُردو)



راجہ محمد حسیب (مدیر)

(بی ای ٹی۔۶)
raja4242@hotmail.com

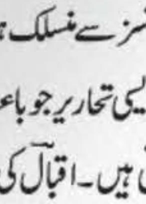
حقیقت میں انسان اپنی زندگی میں جو بھی عمل کرتا ہے وہ کسی نہ کسی خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ ''سعی'' کا مدیر بننا بھی میرا ایک خواب تھا جو پورا ہوا۔ میرا تعلق شعبہ الیکٹریکل انجینئرنگ سے ہے۔ علم و ادب سے شغف رکھتا ہوں اور شاعری میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ احمد فرازؔ پسندیدہ شاعر ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں سے بس اتنا ہی کہوں گا! '' کچھ محبتیں تو وہ ہوتی ہیں جن کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔ آدمی اندر ہی اندر دھیمی آگ پر رکھے دودھ کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ کچھ محبتوں میں ندی کی لہروں سی روانی ہوتی ہے اور کچھ میں دریاؤں کی سی طغیانی' کچھ محبتیں آبشاروں کی طرح ہوتی ہیں کہ جب نچھاور ہوں تو شور مچاتی ہیں اور کچھ دور پربت کے دامن سے پھوٹنے والے جھرنوں کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی' میٹھی میٹھی اور دھیمی دھیمی۔ محبتیں جلنے کا عزم عطا کرتی ہیں اور قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہیں، محبتیں جیسی بھی ہوں رنگ لاتی ہیں اور ''سعی''، ہم سب مدیران اور ہمارے سرپرست اساتذہ کی اپنے ادارے سے محبت کا اظہار ہے۔



سیّد نبیل حسن (مدیرِ اعلیٰ)

(بی بی اے۔۸)
nabeel_h1@yahoo.com

میں شعبہ مینجمنٹ سائنسز سے منسلک ہوں۔ ادب کا تعلق چونکہ خیال اور اظہارِ خیال سے ہے سو ذہن ودل نے ابتداء سے ہی اِس سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔ ایسی تحاریر جو باعثِ تلذذ ہونے کے ساتھ ساتھ خوابوں کی گل کاری اور فکرِ انسانی کی آبیاری کا فریضہ ادا کرتی ہوں مجھ کو زیادہ لبھاتی ہیں۔ اقبالؔ کی خودی، فیضؔ کی بغاوت، غالبؔ کے خیال، پروینؔ کے احساس اور فرازؔ کے انداز کو شاعری کی جان اور زندگی کی آن سمجھتا ہوں۔ گو کہ ان تمام پھولوں کا ایک گلدستے میں یکجا ہونا اہم نہیں لیکن دردِ حیات کے اِلتیام کیلیئے یہ اکسیر ناگزیر بھی ہے!!!



کنول رانی (مدیرہ)

(بی بی اے۔۶)

اُس بابرکت ذات کے نام سے شروع جو دِلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ میرا تعلق شعبہ مینجمنٹ سائنسز سے ہے۔ ادب سے لگاؤ کے باعث اچھی چیز کو پڑھنا اور اُس سے سیکھ کر اپنی اور دوسروں کی زندگیوں میں بہتری لانے کی خواہش مند ہوں۔ زندگی کے معنی جاننا اور بات کرنا اچھا لگتا ہے کیونکہ زندگی کو جان کر ہی اِسے بھرپور انداز میں گزارا جاسکتا ہے اور کامیابی وکامرانی کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو جانچا جائے۔





محمد رضا سرگانہ (نائب مدیرِ اعلیٰ)

(بی ای ٹی۔۶)

msargana@yahoo.com



میری طبعیت میں ہمیشہ سے بغاوت کے عناصر رہے ہیں اور باغی شخص کو اظہار کی طلب تڑپاتی رہتی ہے۔ جب حالات کو سمجھنے کے قابل ہوا تو اظہار کے لیے ماحول ناسازگار پایا۔ انہی ناسازگار حالات نے اظہارِ تمنا کے سعی میں سوچ پہ پہرے بٹھانے کی بجائے، زباں کو تالا لگایا اور میرا رشتہ قلم سے جوڑ دیا۔ اب جو جی میں آئے، نذرِ قرطاس کر کے بے فکر ہو جاتا ہوں۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دِل جلا کے سرِ عام رکھ دیا ہے

قلم سے رشتہ مُجھے آج ''سعی'' اور آپ کی محفل میں لے آیا۔ لٹریچر سے خاص شغف ہے۔ پسندیدہ کُتب میں نسیم حجازی کی ''خاک اور خون'' اور پریم چند کی ''میدانِ عمل'' ہیں۔ جبکہ ساحرؔ، محسنؔ نقوی، امرتا پریتم، غلام عباس، منٹو، فیضؔ، ٹالسٹائی اور موپساں کے اندازِ تحریر سے کافی متاثر ہوں۔ گلاب وانارکلی سا پیارا دل رکھنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔ پیغام کے لیے حضرت علیؓ کا قول نقل کروں گا۔ ''صبر ایسی سواری ہے جو انسان کو کبھی نہیں گراتی''۔

مبشر احسن (مدیر و گرافک ڈیزائنر)

(بی ای ای۔۷)

cranchu_popet@hotmail.com



اللہ رب العزت نے انسان کو عقلِ سلیم کا گراں بہا تحفہ عطا فرما کر بڑا احسان کیا اور انسان نے اپنے خالق کی عطا کردہ عقل سے عِلم کی جنت قائم کر لی۔ وہ انسان اپنے عقلی اور علمی مشاہدات اور تجزیات کو سُپردِ قلم کر کے اپنے وارثوں کو علم و عمل کا بحرِ بے کنار عنایت کرتا ہے۔ ''سعی'' کا مدیر بننا میرا خواب تھا جو پورا ہوا۔

گرافک ڈیزائنر ہونے کے ناطے میں اپنے والدین اور اُن تمام ساتھیوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کی اور اس کام کو بخوبی سرانجام دینے میں میری مدد کی۔ جن میں سب سے پہلے جناب مہدی عباس (شعبۂ ای ای)، رانا محمد راشد قمر (مرحوم)، راجہ حسیب، احسن اقبال، مریم صدیقی اور خدیجہ طارق شامل ہیں۔

مُجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ''سعی'' ابھی فکر و عمل کے ناپختہ مراحل میں ہے۔ لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ ''سعی'' کا نیا مُجلہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔



> ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اس شمارے کو ممکنہ غلطیوں سے پاک رکھا جائے۔ بہر حال معیارِ تحریر میں کمی ہو سکتی ہے کہ یہ خالصتاً طلباء کی کاوش ہے۔ اگر پھر بھی کوئی خامی رہ گئی ہو تو مجلسِ ادارت اور تکنیکی ماہرین معذرت خواہ ہیں۔

ویژ انجیز: احسن اقبال (بی ای ای ۔ ۲)

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال
یہ اُمتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

علامہ اقبال



مشعلِ ہدایت



اور جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا حکم مانے، تو اسے اُن کا
ساتھ مِلے گا جِن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق
اور شہداء اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔
(النساء۔٦٩)

حمد

رفعتیں تیرے لیے ، سب عظمتیں تیرے لیے
خالقِ حرف و بیاں سب مدحتیں تیرے لیے

زندگی تیرے لیے اور بندگی تیرے لیے
اُلفتیں تیرے لیے،سب چاہتیں تیرے لیے

تُو کہ لا محدود ہے ، حدِ مکاں بھی تُجھ سے ہے
سرحدِ امکاں تلک ، سب رفعتیں تیرے لیے

عقل حیراں ہے کہ کیسا ہے نظامِ کائنات
اے حکیمِ بے بدل ! سب حکمتیں تیرے لیے

میں کہ بندہ ہوں تو پھر بندے کا کیسا اختیار
قادرِ مُطلق ہے تُو ، سب قُدرتیں تیرے لیے

حرف سب تیرے لیے ہیں ، لفظ سب تیرے لیے
صورتِ اظہار کی سب صورتیں تیرے لیے

شاعر:ڈاکٹرمحمدامین

نعت

سوئے مدینہ جب طلبِ خستہ تن چلی
عنبر فشاں نسیم چمن در چمن چلی

یہ کون لامکاں کی طرف عطر بیز ہے
کس جانِ صد بہار کی بوئے بدن چلی

دنیا کہیں بھی پا نا سکی جب سکونِ زیست
کاسہ بدست سوئے درِ پنجتن چلی

الحاد کا تھا حبس زمانے کے صحن میں
فاراں کی چوٹیوں سے ہوا دفعتاً چلی

اے رحمتِ تمام کرم کی نگاہ کر
اِس کارگاہِ زیست میں ہم پر تو بن چلی

جو بھی تھی آرزو دلِ ہستی میں اے وسیم
اُلفت بداماں سوئے نبیؐ زمن چلی

شاعر: وسیم ممتاز

حقِ بندگی کیا ہے؟

سید شبر رضا (بی ای ٹی۔ ۷)

حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے پروردگار سے شبِ معراج سوال کرتے ہوئے عرض کیا ''اے مالک کونسا عمل افضل ہے؟'' تو ارشادِ قدرت ہوا ''کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر بھروسہ کرنے اور میری تقسیم پر راضی رہنے سے افضل نہیں ہے۔ اے محمدؐ! میری محبت ان کے لئے ضروری ہے' جو ایک دوسرے سے میری وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ اور میری محبت واجب ہے، ان کے لئے جو میرے لئے ایک دوسرے سے عطوفت وشفقت سے پیش آتے ہیں اور میری محبت لازم ہے ان کے لئے، جو ایک دوسرے سے صلہ رحمی اور میل جول رکھتے ہیں' اور میری محبت ان کے لئے لازم ہے جو مجھ پر توکل کرتے ہیں اور میری محبت کا کوئی نشان غایت اور نہایت نہیں ہے۔ جب میں ان کا ایک علم بلند کرتا ہوں تو ان کا دوسرا علم پَست کرتا ہوں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو مخلوق کو میری نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ اپنی حاجات مخلوق کے پاس نہیں لے جاتے۔ ان کے شِکم حرام کھانے سے محفوظ ہیں۔ اے محمدؐ! اگر تو چاہتا ہے کہ تمام لوگوں سے زیادہ صاحب ورع بنے تو دنیا سے پرہیز کر۔ اور آخرت کی طرف رغبت کر۔'' آپؐ نے عرض کیا ''خدایا کس طرح دنیا سے پرہیز گار بنوں'' فرمایا ''دنیا سے تھوڑا سا کھانا پینا اور لباس لے لو اور کل کے لئے ذخیرہ نہ بناؤ اور مجھے ہمیشہ یاد رکھو۔'' عرض کیا ''پالنے والے! کس طرح تجھے ہمیشہ یاد رکھوں'' فرمایا ''لوگوں سے خلوت کرلو۔ کھٹی میٹھی چیزوں سے بغض رہو۔ اور اپنے شکم اور گھر کو دنیا سے خالی رکھو۔ اے (محمدؐ) اِس طرح سے بچو کہ بچے کی طرح ہو جاؤ''۔ جب وہ سبز اور زرد قسم کی چیز دیکھے اور میٹھی یا کھٹی چیز دیکھے' جو اسے دی جائے تو اس کے دھوکے میں آجائے۔'' آپؐ نے عرض کیا ''پروردگار! مجھے کوئی ایسا عمل بتا کہ جس سے میں تیرا قُرب حاصل کرلوں۔'' فرمایا ''اپنی رات کو دن اور دن کو رات بنالے۔'' عرض کیا ''پالنے والے! یہ کیسے ممکن ہے۔'' فرمایا ''اپنی نیند کی جگہ نماز کو اور کھانے کی جگہ بھوک کو دے دو۔ اے محمدؐ مجھے اپنی جلالت وعزت کی قسم ہے' جو بندہ میرے لئے چار چیزوں کی ضمانت دے دے تو میں اسے جنت میں داخل کردوں گا۔ اپنی زبان کو لپیٹ دے اور سوائے مقصد کے اسے نہ کھولے اور اپنے دل کو وسوسوں سے محفوظ رکھے اور میرے جاننے اور اس پر نظر رکھنے کو یاد رکھے۔ اے محمدؐ! مجھے تین قسم کے بندوں پر تعجب ہے وہ بندہ جو نماز شروع کرے اور اسے پتہ ہو کہ وہ کس کے سامنے ہاتھ اٹھا رہا ہے اور وہ کس کے سامنے کھڑا ہے باوجود اس کے وہ اونگھ رہا ہے اور تعجب ہے اس بندے سے کہ جس کے پاس زمین سے آگے گھاس وغیرہ سے ایک دن کی روزی ہو اور وہ کل کے لئے اہتمام کرے اور مجھے تعجب ہے اس بندہ سے کہ جسے یہ معلوم نہیں کہ میں راضی ہوں کہ ناراض اور وہ ہنستا ہو۔''

''اے احمدؐ! نفس برائی کی پناہ گاہ ہے اور یہ ہر برائی کا ساتھی ہے۔ تو اسے اللہ کی اطاعت کی طرف کھینچے تو وہ تجھے اس کی نافرمانی کی طرف کھینچے گا۔ اللہ کی اطاعت میں وہ تیری مخالفت کرے گا اور جسے تو پسند کرے اس میں وہ تیری اطاعت کرے گا۔ جب نفس سیر ہو تو وہ طغیان و

سرکشی کرتا ہے اور جب بھوکا ہوتو شکایت کرتا ہے جب فقیر ومحتاج ہوتو غضب ناک ہوتا ہے اور جب غنی وتونگر ہوجائے تو تکبر کرتا ہے جب بڑا ہوجائے تو بھول جاتا ہے اور جب مامون ہوتو غافل ہوجاتا ہے۔ وہ شیطان کا قرین وساتھی ہے اور نفس کی مثال شترمرغ جیسی ہے۔ زیادہ کھاتا ہے اور جب اس پر بوجھ رکھا جائے تو پرواز نہیں کرتا اور مثل کیز (ایک دوائی) کے ہے۔ رنگ اس کا اچھا ہے اور ذائقہ کڑوا ہے۔"

اے احمدؐ! ہر وہ شخص جو دعویٰ کرے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میرا مُحِب نہیں جب تک قدرِ ضرورت روزی نہ کھائے۔ پست لباس نہ پہنے۔ سجدہ میں گر نہ جائے' طویل قیام نہ کرے' خاموشی اختیار نہ کرے' مجھ پر توکل نہ کرے' زیادہ گریہ نہ کرے' کم نہ ہنسے' اپنی خواہش کی مخالفت نہ کرے' اور مسجد کو اپنا گھر نہ بنائے' علم کو اپنا ساتھی اور زہد کو ہم نشین نہ بنائے' علماء کو اپنا محبوب اور فُقراء کو اپنا ساتھی نہ بنائے۔ اور میری رضا کو طلب کرے اور نافرمان لوگوں سے بھاگ جائے اور میرے ذکر میں مشغول رہے اور ہمیشہ زیادہ تسبیح کرے اور وعدہ کا سچا ہو اور معاہدہ کو پورا کرے' اس کا دل پاک ہو اور نماز میں زکوٰۃ دے اور فرائض میں کوشش کرے اور میرے پاس جو ثواب ہے اس میں رغبت کرے اور میرے عذاب سے ڈرے اور میرے دوستوں کا قرین وہمنشیں بنے۔"

اے محمدؐ! "اگر کوئی بندہ اہلِ آسمان وزمین جیسی عبادت کرے اور اہلِ آسماں وزمین جیسے روزے رکھے اور ملائکہ کی طرح کھانا کھائے اور ننگے شخص جیسا لباس پہنے۔ باوجود اسکے میں اس کے دل میں دنیا کی وسعت اس کی ریاست اور اس کی زینت کی محبت ذرہ برابر دیکھوں تو وہ میرے گھر میں میرے جوار میں نہیں رہ سکتا اور میں اس کے دل سے اپنی محبت کو نکال دوں گا اور تجھ پر میرا اسلام ہو اور حمد ہے اللہ کے لئے جو جہانوں کا خالق ہے۔"

بشکریہ:-
کتاب:۔ارشادالقلوب
مولف:۔علامہ شیخ ابومحمد حسن
مترجم:۔علامہ الحاج السید صفدر حسن نجفی

ہمارے لیے ۲۴ گھنٹوں میں ۵ بار اللہ کو یاد کرنا مُشکل ہے، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ ۲۴ گھنٹوں میں ہر پل ہمارا خیال رکھے، ہمیں ہر نقصان سے بچائے، ہمیں ہر اُس چیز سے نوازے جس کی ہمیں خواہش ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو تو ہم اللہ سے شکوہ کرنے لگتے ہیں، اُسے بتانے لگتے ہیں کہ اُس نے ہمیں کیتنا بدقسمت بنایا ہے۔ اپنی محرومیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ یہاں اس زمین پر جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جو اس طرح سے معذور ہیں کہ ذہن کے علاوہ اُن کے جسم کا کوئی حصہ کام نہیں کرتا، لیکن وہ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ "اللہ سے سودے بازی نہیں کی جا سکتی"۔

عمیرہ احمد (حاصل)


عکس ریزے

زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے، جسے ہم کمپرومائز کہتے ہیں۔ پرسکون زندگی گزارنے کیلئے اِس کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ جس چیز کو تم بدل نہ سکو، اس کے ساتھ کمپرومائز کرلیا کرو، مگر اپنی کسی خواہش کو جنون نہ بنایا کرو۔ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جو ہمیں کبھی نہیں مل سکتی، چاہے ہم روئیں، چلائیں، یا بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں، کیونکہ وہ کسی دوسرے کے لئے ہوتی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ زندگی میں ہمارے لئے کچھ ہوتا ہی نہیں ہے، کچھ نہ کچھ ہمارے لئے بھی ہوتا ہے۔ مانا یہ سب تکلیف دہ ہے، مگر انسان کو خود کو اتنا مضبوط بنانا چاہئے کہ ایسی تکلیفوں کو برداشت کرسکے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجاتا ہے۔ صبر آجاتا ہے، سکون آجاتا ہے۔ (عمیرہ احمد)

زندگی

محمد رضا سرگانہ (نائب مدیر اعلیٰ)

فکرِ معاش ' ذکرِ خدا ' یادِ رفتگاں
دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

''زندگی''۔۔۔۔کیا ہے زندگی۔۔۔۔۔؟

ایک لامتناہی سلسلہ' جوسرد وگرم' خوشی' غمی' حرص وہوس' غربت وامارات' درد ومسیحائی' علم وجہالت' عزت وبے توقیری' محبت ونفرت اورنجانے کون کون سی پہاڑیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ حالات کے جس سمندر کے پاس سے گزررہا ہے اُس کے قُرب وجوار کے رہائشی پھر بھی تشنہ لب ہی رہے ہیں۔

کبھی گرمی ' کبھی سردی ' یہ قدرت کے نظارے ہیں
پیاس اُن کو بھی لگتی ہے جو سمندر کے کنارے ہیں

کیا درجِ بالا کے علاوہ بھی زندگی کے مفاہیم نکالے جاسکتے ہیں' یا' پھر زندگی تمام لذتوں کے مقصود ہونے کا نام ہے۔۔۔۔؟ کیا خواہشات کو پالینا ہی زندگی ہے' یا مصائب وآلام کو سہنا۔۔۔۔!! خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہونے میں ہی لطافت ورنگینی ہے، یا'' اناالحق'' کی بلندیوں کو پالینا۔۔۔۔!! اور کیا معلوم کہ ''اناالحق'' بھی نفس سے مغلوبیت ہو۔۔۔۔!! پھر'' کیا ہے زندگی۔۔۔۔۔؟؟؟'' چند ٹکوں کی خاطر ہاتھ بڑھا لینا۔۔۔۔ اُس پیٹ کے لئے تگ ودو کرنا جس کے جہنم کو بجھانے کا وعدہ پیدا کرنے والے نے خود کیا ہے۔۔۔۔ کیا یہ اُس کے کاموں میں دخل اندازی ہے۔۔۔۔؟'' ہاں'''یا پھر شاید نہیں بھی!

جنت کی تلاش میں' سسکتی' بلکتی' تڑپتی'۔۔۔۔ دہلتی چیخوں میں۔۔۔ نعرہ حق'''' اللہ اکبر'' کی آواز میں حقیقت کو پالینا۔۔۔دوامِ زندگی۔۔۔!! یا پھر'' کیا ہے زندگی''؟

ہجر کے صدمے اگر کچھ اور بھی بڑھنے لگے
زندگی کا روگ بن کر ' زندگی رہ جائے گی

(فاروق فیصل)

کسی کو ایذا پہنچانے کی غرض سے چند خاکے بنالینا۔۔۔ یا لذتِ ایذا رسانی سے مفقودیت۔۔۔ اُس بیمار بڑھیا کے گھر کا کام کرنا جو روزانہ

کوڑے کا ڈھیر پھینکے۔۔۔ خیبر کے قلعے پر چڑھائی۔۔۔ کفار سے معاہدے۔۔۔یا مدینے کی مسجد کو" مسجدالمنافقین" قرار دینا۔۔۔جنرل ہود کا گوانتانا موبے کی جیل کی لیٹرین۔۔۔قرآن۔۔ ہاہ آہ ہاہ۔۔۔ ہائے' ہائے۔۔۔کربلا کی سرزمین پر حقیقت کو بچانا۔۔۔یا آج حقیقت کو بچانے والے کی حقیقت کو کرب وبلا میں مٹانے کی کوشش۔۔۔کیا ہوا تھا' کیا ہورہا ہے' کیا ہونے والا ہے۔۔۔؟؟؟

اور پھر" کیا ہے زندگی؟؟؟"

جس کوکھ سے جنم لیا' پھر اسی کوکھ کا سودا۔۔۔سندھ کی بیٹی کی پکار پر لاؤلشکر سمیت چڑھائی۔۔۔صافے میں جوتے باندھ کر چلنے والے راہگیر پر گولی چلانا' اور پھر مال نہ ملنے پر کف افسوس۔۔۔کہ گولی کیا ہوئی۔۔۔۔؟؟ چٹیل میدان میں، چلچلاتی دھوپ میں ادائیگی نماز۔۔۔یا اے سی کی ٹھنڈک۔۔۔ ایکڑوں پر محیط گھر میں بیٹھ کر دردوکسک کے ذاکر۔۔۔یافٹ پاتھ پر سونے والے کے گلے۔۔۔لفظ سکھانے والی ماں۔۔۔یازبان کی تیزی آزمانے والا۔۔۔خوشحال بیٹا۔۔۔یا اولڈ ہاؤس میں رہنے والا باپ۔۔۔کیا تھی زندگی؟ کیا ہے زندگی؟ کیا ہوگی زندگی؟

ایک خواب کے حالات درج کررہا ہوں۔

"ایک وسیع وعریض قلعہ ہے، جس کی دیواریں پرانی' مضبوط' بلندوبالا دکھائی دے رہی تھیں اوراس میں ان گنت دروازے تھے۔ میں چلنے سے قاصر تھا مگر مجھے کسی نے تھام رکھا تھا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اس قلعے کی سیر کرائی جارہی ہے۔ جس دروازے سے مجھے اندر داخل کرایا گیا تھا اس کے چہار سو گل بوٹے اور خوبصورت جھاڑیاں تھیں۔ میں انہیں صرف دیکھ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ ان کو چھوسکوں مگر پھولوں کی نرم ونازک پتیوں کو مجھ پر نچھاور کیا جاتا رہا۔ ان پھولوں کی کونپلوں اور پتیوں کے ساتھ اگر کوئی کانٹا ہوتا تو مجھے تھامنے والے مہربان ہاتھ اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتے۔ آہستہ آہستہ مجھ میں اتنی سکت آگئی کہ میں اپنے پیروں پہ چلنے لگا مگر وہ ہاتھ' پھر بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس قلعہ نما باغ میں' گھومتا گھومتا کافی دور جاچکا تھا۔ اب کبھی کبھی گلوں کو توڑتے میرے ہاتھ خاروں پر بھی پڑجاتے ،جن کی چبھن مجھے کافی دیر تک محسوس ہوتی، مگر میرے مسیحا ہاتھ میری چوٹ کے اثر کو زائل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ چلتے چلتے گل بوٹے کم ہونے لگے۔ خاردار جھاڑیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اب راستے میں پڑے کنکر پیروں کو بھی زخمی کرنے لگے تھے۔ دھوپ کی حدت بڑھتی جارہی تھی۔ آخر گرمی کی شدت اتنی زیادہ ہوگئی کہ چلنے سے دل گھبرانے لگا مگر کوئی ان دیکھی قوت مجھے چلنے پر مجبور کیے ہوئے تھی۔

چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا کہ جس میں آگے ہزار ہا راستے تھے اور مصائب وآلام سے بھرپور۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس راستے کا انتخاب کرنا ہے' لیکن بھلا ہو اُن مشفق ومہربان ہاتھوں کا' کہ جنہوں نے مجھے ایک قدرے بہتر راہ پر ڈال دیا۔ پھر بیشتر میں اپنے راستے

سے بھٹکتا اور مجھے دوبارہ بہتر راہ پر ڈال دیا جاتا رہا مگر۔۔۔۔ یہ آنکھ مچولی آخر کو ختم ہوگئی۔۔۔۔ میں اپنے راستے سے بھٹکا تو بھٹکتا ہی چلا گیا۔۔۔۔ میں اپنے تئیں بہتر راہ کا انتخاب کرنے کی کوشش کرتا مگر نتیجہ "ندارد" اور پھر کوئی راہ بھی نہ بچی' میں خاردار جھاڑیوں اور سنگریزوں سے بھرے میدان میں آچکا تھا۔ میں لاکھ بچا کر قدم رکھتا مگر میرے پاؤں لہولہان تھی۔۔۔۔ اور چلنے کی مجھ میں سکت نہ رہی۔۔۔۔ پیچھے مڑ کر دیکھا' تو واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔۔۔ وہاں رُکا بھی نہیں جاسکتا تھا۔۔۔۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ آگے بڑھا جائے۔۔۔۔ مگر زخمی اور نڈھال' بے جان پاؤں آگے بڑھنے نہ دیتے تھے۔۔۔ چلنا تو تھا ہی۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔ میں نڈھال و بے آسرا ہو کر گر پڑا۔۔۔ منزل آچکی تھی۔۔۔۔۔

آئے تھے ہم سیر کرنے ' سیرِ گلشن کر چلے
سنبھال مالی باغ اپنا ہم مسافر گھر چلے

کیا یہ خواب تھا۔۔۔۔۔؟
اجزائے زندگی
حقیقتِ زندگی۔۔۔۔۔
یا پھر!!
"کیا ہے زندگی۔۔۔۔۔؟؟؟"

سفر جو ہو کٹھن کوئی ، تو دل چھوٹا نہیں کرنا
مُجھے تُم ہمسفر رکھنا ، کہ میرے ساتھ ہو لینا

مُجھے غیروں میں رکھتے ہو ، مُجھے معلوم ہے جاناں
کبھی جو چوٹ کھاؤ تو ، جو چاہو تو چلی آنا

سید آفتاب راشد (بی سی ای۔۶)

وہی میرا سب کچھ ہے

راجہ محمد حبیب (مدیر، حصہ اُردو)

''ماں'' ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس چھوٹے سے لفظ میں اس کائنات کی ہر شے سمائی ہوئی ہے۔ ماں وہ لفظ ہے جس کی حقیقت جان کر ہی انسان دنیا اور آخرت میں فلاح پا سکتا ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کسی نہ کسی صورت میں ماں اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ بچپن میں اس کی دیکھ بھال کر کے' جوانی میں اسے سیدھا راستہ دکھا کر اور بڑھاپے میں یادوں کا گہرا سمندر بن کر۔ فردوسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ !

''اگر مجھ سے ماں چھین لی جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا''

ماں وہ چشمہ ہے جو کبھی نہیں سوکھتا اور' اس میں سے ہمہ وقت عظمت' بڑائی اور پیار کے چشمے پھوٹتے رہتے ہیں۔ ماں وہ مینارۂ نور ہے جو ازل سے اس دنیا کو روشنی دے رہا ہے اور ابد تک دیتا رہے گا۔

ماں اپنے بچوں کے لئے سختیاں اٹھاتی ہے۔ راتوں کو جاگتی ہے۔ جو تکلیفیں وہ برداشت کرتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اپنے بچے کو جنم دیتے وقت اس پر قیامت ٹوٹتی ہے۔ پھر جب اس کا راج دُلارا بستر گیلا کر دیتا ہے تو اسے اپنی جگہ پر سلا دیتی ہے۔ چاہے اس کی ساری رات آنکھوں میں کٹ جائے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے !

مدت سے میری ماں سوئی نہیں ہے دانش
میں نے اِک بار کہا تھا ''مجھے ڈر لگتا ہے''

پھر جب اس کا پیارا بیٹا درسگاہ' مادرِ علمی کا رخ کرتا ہے تو اس کو ہر طرح کی برائی سے بچاتی ہے اور ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے اور اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو ماں محنت مزدوری کرنے سے بھی نہیں کتراتی۔ اگر ماں جیسی عظیم ہستی نہ ہوتی تو یہ دنیا وجود میں نہ آتی۔ یہ ماں ہی ہے جو اس دنیا کو اپنی محبت کی خوشبو سے مہکا رہی ہے۔

اسی ماں نے مجھے دنیا کے مصائب سے بچائے رکھا۔ ماں کی دعائیں ہر لحہ میرے ساتھ رہیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے امتحان' ساری مشکلات اور سارے مسائل خود بخود ہی حل ہوتے چلے آئے ہیں۔ انہی دعاؤں کی بدولت میرا مستقبل روشن ہے۔ انشاء اللہ یہ میری ماں ہی ہے جس کے لئے میں جی رہا ہوں اور جیتا رہوں گا۔

میری ماں ہی میرا سب کچھ ہے۔

وراثت کی یہی جاگیر افضل
میں چھوٹا ہوں میرے حصے میں ماں آئے

''مسکراہٹ''

محمد فیضان فضل (بی ای ٹی۔۵)

ایک حدیث کے مطابق ''جو شخص اپنے والدین کو مسکرا کے دیکھتا ہے اُسے ایک قبول حج کا ثواب عطا کیا جاتا ہے''۔

مسکراہٹ کہنے کو تو صرف ایک لفظ ہے مگر اپنے اندر فلسفۂ زندگی سموئے ہے۔ یہ وہ تیرِ جفاکش ہے کہ کمان سے نکلنے کے بعد ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح آپ کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ کسی کے لئے زہر خند ثابت ہو سکتی ہے تو کبھی بڑے بڑے طالع آزماؤں کو زیر کر لیتی ہے۔۔۔۔

مسکراہٹ کسی کے لئے زندگی کی نوید ثابت ہو سکتی ہے تو کسی کے لئے زندگی کا آسرا۔ یہ وہ دولت ہے جو بے دریغ استعمال کرنے سے بھی کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو کبھی تنقید کا نشانہ نہیں بنا اور نہ ہی باعثِ ذلت و ملامت رہا ہے۔ اس کے برعکس مسکراہٹ کے پھول بکھیرنے والے کو سب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں تعریفی کلمات کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ الفاظ کے گھاؤ بہت گہرے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ جبکہ مسکراہٹ زخموں کو مندمل کرنے کی اکسیر دوا ہے۔ اس پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی کی شخصیت کو جانچنے کے لئے اس کے چہرے کے خط و خال کا جائزہ لیا جائے۔۔۔۔۔۔ اور زندہ دل شخص کے چہرے سے پھوٹتی مسکراہٹ کی کرنیں، دوسروں پر اس کی شخصیت کے مثبت پہلو کو اجاگر کرتی ہیں۔

کسی دانا کا خوبصورت قول ہے۔۔۔۔۔ ''اگر تم کسی کی حاجت روائی نہیں کر سکتے، تو ایک لمحے کی مسکراہٹ سے اسے تم زندگی کی رونقوں کی طرف واپس لا سکتے ہو''

مسکراہٹ وہ احساس ہے جو آپ کو خود اعتمادی، یقینِ کامل، خوش اخلاقی، حُسنِ سلوک اور زندہ دلی جیسے نایاب تحفے دیتا ہے۔ مسکراہٹ وہ ہتھیار ہے جو نفرت اور دوریوں کی خندق کو پاٹ کر محبت کا تاج محل تعمیر کر سکتا ہے۔

بھولے سے مُسکرا تو دیتے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

مسکراہٹ، ہمیشہ اپنے پن کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔۔۔ ایک اجنبی کو بھی آپ مسکراہٹ کے ذریعے آشنا بنا سکتے ہیں۔ مسکراہٹ بکھرے دلوں کو سمیٹ سکتی ہے، اجڑے دلوں کو آباد کر سکتی ہے اور ناشاد دلوں کو شاد کر سکتی ہے۔۔۔۔۔

وے ظالموں' اے تساں کی کیتا اے

جناب عاطف عبدالمجید۔شعبہ ای ای

میں یونیورسٹی سے واپسی پر اپنی گلی میں داخل ہوا تو دیکھتا ہوں کہ افسردگی کا سماں طاری ہے۔ سائباں لگایا جارہا ہے۔ کرسیاں رکھی جارہی ہیں۔ جس مکان کے سامنے یہ انتظام کیا جارہا تھا، میں اس کے مکینوں سے واقف نہ تھا۔ موت پر دکھ ہوا جو کہ ایک فطری عمل تھا۔ فرضی کلمات پڑھے جیسا کہ صدیوں سے پڑھے جارہے ہیں۔ ویسے بھی اسلام آباد شہر، جس کی جڑوں میں نوکر شاہی رچی بسی ہے، سرد مہری اس کا خاصہ ہے، یہاں فرضی جملے ہی چلتے ہیں۔

گھر داخل ہونے پر پتہ چلا کہ اغواء برائے تاوان کا معاملہ تھا۔ تاوان نہ ملنے پر مغوی کو ہلاک کر دیا گیا۔ یہ سن کر دکھ کی شدت یا پھر شاید تجسس میں اضافہ ہوا، پھر سے فرضی جملے دہرائے کہ زمانہ بہت برا ہو گیا ہے انسانیت پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جس گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی ، وہاں پہنچنے پر تفصیلات کا علم ہوا۔ اغواء اور ہلاک ہونے والا شخص کسی غیر ملکی این جی او کا سربراہ تھا۔ اسے بنوں کے نواح سے مقامی طالبان کے گروہ نے اغواء کیا اور تاوان کی بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ اڑھائی ماہ گزرنے کے باوجود گھر والے رقم کا انتظام نہ کر سکے، جس کے نتیجے میں اس ''کافر'' کا سر قلم کر دیا گیا۔ سینے میں تیں گولیاں اتاریں اور لاش کو ایک تابوت میں بند کر کے اس پر یہ کلمات درج کیئے گئے۔

''اسلام اور جہاد کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں ہم نے اس کافر کو جہنم واصل کیا''

ظاہر ہے یہ پیغام مرنے والے کے لواحقین کے لئے بھیجا گیا تھا۔ غالباً اس کی بوڑھی ماں' اس کی جوان بیوہ' اس کے ضعیف باپ یا شاید اس کی کمسن بیٹی کے لئے ، کہ شاید ان کا دکھ یہ جان کر ہلکا ہو جائے کہ اس قتل کے نتیجے میں اسلام سربلند ہوا، ایک شیطان کی کمی ہوئی اور نہ جانے کتنے مومنوں کا اضافہ ہوا۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس لاش لے کر پہنچی ،مقتول کی بیوہ' جو نہ جانے اب تک کیسے ضبط کیئے بیٹھی تھی ، چیختی چلاتی گھر سے باہر نکل آئی اور اونچا اونچا چیخنے لگی۔ کوئی الفاظ نہیں تھے، محض بلند' تیز چیخیں، کانوں کے راستے ذہن اور دل کو چیرتی ہوئی چیخیں' ایک جوان بیوہ کی فضاؤں کو چیرتی ہوئی چیخیں۔ چند لوگوں کے ہمراہ میں تابوت کو کندھے پر اٹھائے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں نعش کو رکھا جانا تھا۔ ابھی میں بیوہ کی چیخوں سے ہی سنبھل نہ پایا تھا کہ دیکھا کہ کمرے کے دروازے کے پیچھے ایک گود اجاڑ کر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں بین کر رہی ہے۔ ہلکی آواز میں انتہائی زہریلا بین' ایک ہی جملہ دہرائے جارہی ہے۔

''وے ظالموں' اے تساں کی کیتا اے''

نعش کی حالت خراب تھی۔اسے زیادہ دیر نہیں رکھا جاسکتا تھا۔فیصلہ ہوا کہ کچھ دیر میں اسے تدفین کے واسطے اٹھالیا جائے گا۔تب مرحوم کی بیوی' جواب تک صرف چلارہی تھی، ہاتھ جوڑ کر بولی''ایک گھنٹہ' صرف ایک گھنٹہ دے دیں۔مجھے جی بھر کر اسے دیکھ تو لینے دیں۔آج اتنے عرصے بعد گھر آیا ہے۔'' وہ جس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں تھیں،اسی کے ساتھ ایک گھنٹہ گزارنے کی بھیک مانگ رہی تھی۔

ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد جب ہم تابوت اٹھانے پھر اس کمرے میں داخل ہوئے،توماں وہیں دروازے کے پیچھے موجود تھی جہاں اسے چھوڑ کر گیا تھا اور وہی سوال دہرارہی تھی۔یہی سوال اس کا بین تھا۔جیسے وقت اس کے لئے ٹھہر گیا ہو،جیسے اب وہ اپنی ساری عمر یہیں بیٹھے یہی سوال دہراتے دم توڑ دے گی۔

بیوہ سے عورتیں کہنے لگیں کہ تمہارے شوہر کو لیکر جارہے ہیں،کلمہ پڑھو' تب اس نے سوال اٹھایا کہ وہ کلمہ کیوں پڑھے؟ وہ اڑھائی ماہ سے شوہر کی واپسی کا یقین لئے سچے دل سے کلمہ پڑھتی رہی ہے۔اب وہ کلمہ کیوں پڑھے۔۔۔۔اس کا تو جیسے یقین ہی مٹ گیا ہو۔جب اڑھائی ماہ 'دن رات' سچے دل سے تڑپ تڑپ کر کلمہ پڑھتے ہوئے کی گئی دعائیں قبول نہیں ہوئیں تو اسے وہاں موجود عورتیں کیسے سمجھا پاتیں کہ اب کلمہ پڑھو' شاید اب تیری سنی جائے۔

لاش کو ایمبولینس میں رکھتے ہوئے میری نظر اس گھر کی چھت پر پڑی۔اس کی ماں جسے دیکھ کر میں سمجھا تھا کے دروازے کے پیچھے ہی دم توڑ دے گی۔چھت پر کھڑی اپنے بیٹے کا دیدار کر رہی تھی۔اپنے بیٹے کی لاش کا دیدار' سرکٹی' گولیوں سے چھلنی لاش کا دیدار' وہ جس نے اپنے ماں باپ کی لاش کو کندھا دینا تھا' اسی کی خون ٹپکاتی لاش کا آخری دیدار۔

ساری رات میرے ذہن میں سوال اٹھتے رہے' آخر ہم سب یہاں تک کیسے پہنچے۔کیا یہ سب ایک سیاسی غلطی تھی۔ یا ایک نظریاتی اختلاف کا نتیجہ تھا' ایک مذہبی مسئلہ تھا' ایک سماجی جرم' آخر بحیثیت قوم و معاشرہ ہم سے غلطی کہاں اور کیسے ہوگئی؟

صبح یونیورسٹی میں چند لوگوں کے آگے یہ سوالات رکھے۔کسی نے کہا کہ اس واقعہ کو اس کے مکمل تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے' تاکہ یہ رائے قائم کی جاسکے کہ طالبان کا یہ اقدام درست تھا یا غلط (یعنی اس اقدام کے جائز اور درست ہونے کے قوی امکانات موجود تھے)۔

آخر کو مرنے والا ایک این جی او کا سربراہ تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ملک اور دین کے خلاف سازشوں میں ملوث ہو اور اپنے منطقی انجام کو پہنچا ہو۔

ایک رائے یہ تھی کہ ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں اور انقلاب بہرحال خون مانگتا ہے۔ایک جواب میرے پاس بھی تھا کہ یہ سب ہماری قوم کی بدنیتی کا نتیجہ تھا۔کسی دور میں ہم نے چاہا تھا کہ جہاد کے نام پر ممبئی' دہلی اور اسرائیل کی مائیں' بیٹیاں' بیوائیں' بین کریں وظیفے لینے اور جمعرات کا انتظار کرنے والے کے ہاتھ میں بھاری اسلحہ تھمایا اور آج اپنے ہی جال میں پھنس گئے۔آج ہماری مائیں' بیٹیاں اور بیوائیں بین کر رہی ہیں۔

دوپہر کو میرا گزر گھر کے قریب جامع مسجد کے قریب سے ہوا۔مولوی منبر پر چڑھا نماز جمعہ کے مجمع سے خطاب کر رہا تھا۔میرے سوالوں

کا ایک جواب اس کے پاس بھی تھا کہنے لگا کہ یہ تمام واقعات حکومت کی کافرانہ پالیسیوں کا ردِعمل ہے۔ جب تک حکومت ایسے اقدامات کرتی رہے گی ایسے افسوسناک واقعات ہوتے رہیں گے۔

میرے پاس مختلف جوابات کی ایک فہرست اکٹھی ہو چکی تھی۔ ملک کے ایک پڑھے لکھے شہری کی رائے میں غیر ملکی سازشوں میں ملوث این جی او کے سربراہ کا قتل جائز ہے۔ طالبان کی رائے میں دین کے خلاف سازشوں کے مرتکب کا قتل جائز بلکہ برحق ہے، منبر پر چڑھا مولوی چلا رہا ہے کہ حکومت کی اسلام اور ملک دشمن پالیسیوں کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ مگر ان تمام جوابات کو میں اس بوڑھی ماں کے آگے کیسے رکھوں؟ جو آج بھی اپنی چھت پر کھڑی، اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرائے جا رہی ہے۔

''وے ظالموں، اے تساں کی کیتا اے؟''

یہی سوال اس کا بین ہے۔ یہی سوال ہماری پوری قوم کا بین ہے، اور شاید یہی سوال آنے والی نسلوں کا بین ہے۔۔۔۔

میرے عشق دے وچ معشوق نہ ہو
میں اَج تک غلط نگاہ کیتی

تیری ہر مُلاقات میں اینج کیتی
جیویں موسیٰ نال خُدا کیتی

میں فرق کیتا تیری پُوجا وِچ
میں خطریاں دی پرواہ کیتی

اِک تینوں رب نئیں کہہ سکدا
باقی ساری رسم ادا کیتی

(بلھے شاہ)

''مولانا جلال الدین رومی''

عمیر لطیف (بی سی ای-۴)

حضرت مولانا روم:-

حضرت مولانا رومؒ کی عظمت وشان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آج بھی ان کے تذکرے سے عرب وعجم کی محفلیں گونجتی ہیں۔ان کے نام اوران کے کلام کو آج بھی اہلِ نظر وصاحبانِ باطن سرمایۂ تسکین بنائے ہوئے ہیں ان کی ذات پر تاریخ اسلام کو بلا شبہ ناز ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ ان کو اپنے مُرشدِ **معنوی** سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کا کوئی مجموعہ کلام ایسا نہیں کہ جس میں علامہ موصوف نے مختلف رنگ میں اپنی عقیدت کے پھول، مولانا رومؒ کی بارگاہ میں پیش نہ کیے ہوں۔"بالِ جبریل" میں فرماتے ہیں:

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب' ایک کلیم سربکف

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں واضح طور پر اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ جو کیف ومستی ان کے اشعار میں نظر آتی ہے وہ مولانا روم کی عطا کردہ ہے۔ایک اور جگہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ عارف رومی کی اس تلقین کے بعد میں نے راز خودی کو **آشکار** کیا ہے۔''جاوید نامہ'' میں علامہ "مولانا رومؒ" کی مدح سرائی میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اسی جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ نے پیر رومیؒ کی رہبری میں عالم افلاک کی سیر کی ہے۔اسی روحانی سیر میں پیر رومی نے ان پر زندگی کے مختلف اسرار ورموز کی عقدہ کشائی کی ہے۔جاوید نامہ میں علامہ پر مولانا روم کے روحانی فیوض وبرکات کا اثر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔علامہ اقبالؒ کے ان محبوب صوفی اور مُرشد کے مختصر حالات زندگی ذیل کی سطروں میں بیان کیے گئے ہیں۔

حالات:-

مولانا جلال الدین محمد بن سلطان العلماء بہاؤالدین محمد بن حسین الخطیبی ایران کے شہر بلخ میں ۶۰۴ ھ (۸-۱۲۰۷ء) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد محترم محمد بن حسین ملقب بہ بہاؤالدین اُس دور کے اکابر ومشائخ میں شمار ہوتے تھے۔اور سلطان علاؤالدین خوارزم شاہ کے دربار میں بڑا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔۶۱۷ ھ (۲۱-۱۲۲۰ء) میں آپ کے والد نے اپنے صاحبزادے کے ساتھ حج کے ارادے سے سفر کیا۔اس وقت مولانا روم کی عمر چودہ سال تھی راستے میں آپ کا گزر جس جس شہر سے ہوتا لوگ آپ سے ملنے تشریف لاتے اور بہت سے علماء ومشائخ سے مولانا رومؒ کی ملاقات اسی سفرِ حج کے دوران ہوئی۔

تعلیم وتربیت:-

مولانا نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے مرید سید برہان الدین محقق ترمذی جو اس زمانے میں قونیہ شہر میں مقیم تھے اور عالم دین اور اہل طریقت میں سے تھے ان کے حلقہ درس میں فیض حاصل کیا۔اس کے بعد آپ نے حلب کا قصد کیا اور وہاں کئی مدرسوں سے فیض یاب ہوئے۔حلب سے آپ دمشق تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً سات سال علومِ دینیہ کی تحصیل میں مشغول رہے۔

بیعت:-

دمشق سے مولانا رومؒ پھر قونیہ تشریف لے گئے۔اس وقت مولانا پر ظاہری علوم کا غلبہ تھا۔درس وتدریس اور وعظ میں مصروف رہتے تھے اور مثنوی لکھتے تھے۔سماع وغیرہ سے آپ احتراز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی زندگی میں حضرت شمس تبریزؒ داخل ہوئے۔انہوں نے آپ کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔حضرت شمس تبریزؒ سے آپ کی ابتدائی ملاقات کے بارے میں بہت دلچسپ روایات ملتی ہیں۔ایک روایت ہے کہ مولانا حوض کے کنارے بیٹھے تھے اور آس پاس کتابوں کا ڈھیر موجود تھا۔حضرت شمس تبریزؒ وہاں تشریف لائے اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ مولانا نے کہا کہ یہ وہ علم ہے جس کے بارے میں تم نہیں جانتے،تمھیں اس سے کیا غرض۔حضرت تبریزؒ نے وہ تمام کتابیں اٹھا کر حوض میں ڈال دیں۔مولانا کو نہایت رنج ہوا اور کہا اے درویش تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جن کا ملنا اب ممکن نہیں۔حضرت شمس تبریزؒ نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں واپس نکال دیں،ساری کتابیں بالکل خشک تھیں اور کسی کتاب پر ذرا بھی نمی نہیں آئی تھی ۔مولانا نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت شمس تبریزؒ نے جواب دیا کہ یہ وہ علم ہے جسے تم نہیں جانتے!اس کے بعد حضرت وہاں سے چلے گئے اور مولانا کا یہ حال ہوا کہ گھر بار،مال،اولاد سب چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور حضرت شمس تبریزؒ کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔مولانا رومؒ کے کلام سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولانا نے مثنوی کی حکایات اور تصوف کے رموز واسرار بیان کرنے میں حضرت شمس تبریزؒ کے تصوف کو برابر پیش نظر رکھا ہے۔مولانا مدتِ دراز تک عارف تبریزی کی خدمت میں رہے اور حضرت نے ان کی زندگی میں ایک نئی شمع عشق روشن کی۔

اخلاق واوصاف:-

مولانا رومؒ اپنے اخلاق وکردار میں اتباع رسولؐ اور حسن اخلاق کا پیکر تھے۔آپ کے آئینِ اخلاق میں عبادت وریاضت' خشیت الٰہی' زہدو قناعت' فیاضی وایثار استغنا وبے نفسی اور کسب حلال کا عکس نمایاں تھا۔مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے،آپ کی زندگی عالمانہ جاہ وجلال کی ایک شان رکھتی تھی۔آپ کی سواری کے اردگرد علماء اور طلبہ کا جم غفیر ہوتا تھا اور سلاطین وامراء کے دربار میں بھی تعلقات تھے۔مگر راہ سلوک میں داخل ہوتے ہی یہ سب بدل گیا۔درس وتدریس تو آپ نے جاری رکھی مگر پچھلی زندگی کی یادگار کے طور پر

ورنہ زیادہ تر آپ محبت و معروفت کے نشے میں سرشار رہتے تھے۔ روزے اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی دن تک نہ کھاتے تھے۔ نماز کا وقت ہوتا تو فوراً قبلے کی طرف رخ پھیر لیتے اور انتہائی استغراق سے نماز ادا کرتے خشوع و خضوع کا یہ حال تھا کہ عشاء کی نیت باندھتے تو دو رکعت میں ہی صبح ہو جاتی مگر خشوع برقرار رہتا۔

زہد و قناعت کی یہ انتہا تھی کہ سلاطین و امراء کی جانب سے تحائف آتے تو اپنے پاس کچھ نہ رکھتے۔ جب زیادہ تنگی ہوتی تو لوگوں کے اصرار پر رکھ لیتے۔ جس دن گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر سے درویشی کی بو آتی ہے۔ بے نفسی اور قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ امراء اور سلاطین سے ملنے سے پرہیز کرتے تھے، صرف اخلاقاً ان سے مل لیتے۔ مولانا کو اوقاف کی طرف سے پندرہ دینار وظیفہ ملتا تھا، لہذا اس کے معاوضے میں وہ فتویٰ لکھا کرتے تھے۔ مریدوں کو تاکید تھی کہ کوئی فتویٰ لے کر آئے تو میں جس حالت میں بھی ہوں مجھے خبر کردو تاکہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

تصانیف:-

ا۔ فیہ مافیہ:- یہ مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ مولانا کے صاحبزادے نے اس کا مسودہ تیار کیا تھا۔ اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ دونوں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ دیوانِ شمس تبریزؒ:- یہ مولانا رومؒ کا مجموعہ غزلیات ہے۔ اس کا نام آپ نے اپنے والہانہ عشق و محبت کے اظہار کے طور پر رکھا تھا۔ اس مطبوعہ دیوان میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں۔ اس دیوان کے چند اشعار تبرکاً درج ذیل ہیں:-

ہزار بار پیادہ طواف کعبہ کنی
قبولِ حق نشود گر دلِ بیازاری
زعرش و کرسی و لوح و قلم قروں باشد
دل خراب کہ او رائیچ نشما دی

۳۔ مثنوی مولانا روم:- شاعری اور تصوف کی مے دو آتشہ کو ہم آہنگ کرنے میں بہت سے بزرگان دین کا ہاتھ ہے۔ پہلے رباعی اور پھر مثنوی کو اپنا ذریعہ سخن بنا کر تصوف اور اسرار و نکات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا گیا۔ لیکن آخر میں جس نے ساری فضا کو صوفیانہ جذبات سے معمور کر دیا وہ مولانا رومؒ تھے۔ عارف رومی کی مثنوی نے دلوں میں ایمان و ایقان کی نئی حرارت بیدار کی، مولانا کی مثنوی نے مولانا کے نام کو ثباتِ دوام بخشا۔ مولانا نے مثنوی میں حکایات و قصص کے رنگ میں عرفان و حکمت کے وہ گوہر گراں جمع کئے ہیں جن کی مثال فارسی و عربی ادب سمیت دنیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی۔ جو مقبولیت مولانا کی مثنوی کو حاصل ہوئی وہ دوسروں کے حصہ میں نہ آسکی۔

مثنوی میں چھبیس ہزار اشعار شامل ہیں جو چھ دفاتر پر مشتمل ہیں۔

مثنوی مولانا روم گنجینۂ معارف ہے۔ مولانا نے قصہ و حکایات کے رنگ میں تصوف کو بیان کر دیا ہے۔ اِن جذبات سے بڑے اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔

آپ نے تشبیہ و تمثیل سے کام لیتے ہوئے مسائل کو فہم سے قریب تر کر دیا ہے۔

مولانا کی تصوف میں بنیادی تعلیمات:-

مولانا کی تعلیمات کو اس مختصر مضمون میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ لیکن خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نے زیادہ زور عقل و عشق کے مسئلے پر دیا ہے۔ اسلام نے اگرچہ اشیاء کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے مگر وہ عقل کو بے لگام نہیں چھوڑتا کیونکہ عقل جو دینی وجدان سے محروم ہے۔ وہ امرت نہیں بلکہ زہرِ ہلاہل ہے۔ مولانا نے حواسِ ظاہری کے علاوہ حواسِ باطنی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ حواسِ باطنی، ظاہری حواس سے کہیں زیادہ وسیع اور پختہ ہیں وہ حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

چند چند از حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

مزید عشق کی کرشمہ سازیوں کا بیان کرتے ہوئے فرمایا!

از محبت تلخہا شیریں شود
وز محبت مسہا زریں شود
از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ ، گلخن می شود

مولانا کے کلام میں دوسرا بڑا عنصر انسانیت کا درس ہے۔ جو کہ تصوف اسلامی میں بلند مقام رکھتا ہے۔ آپ نے شخصی سلطنتوں کے اثرات، طبقاتی تفاوت اور دیگر مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اور انسانوں میں عزت نفس کے شعور کو بیدار کیا ہے، جس کو علامہ اقبالؒ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مثنوی مولانا روم میں ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد بڑے دلکش انداز میں ملتے ہیں۔ ایک شاعر نے مبالغہ آرائی سے کہا ہے!

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

وفات:۔

مولانا کے سلسلہ باطنی کا نام جلالیہ یا مولویہ ہے۔آپ نے آخری لمحات میں اصحاب اور مریدوں سے فرمایا کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ سراً وعلانیۃً خدا سے ڈرتے رہو' کھانے' سونے اور گفتگو میں کمی کرو' گناہوں سے دور رہو' روزے برابر رکھو' قیامِ شب کرو' شہوتوں کو ہمیشہ ترک کرتے رہو' ہر طرح کے لوگوں کی جفا برداشت کرو' عامیوں کی ہم نشینی چھوڑ دو' نیکوں اور بزرگوں سے محبت رکھو' بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور بہترین کام وہ ہے جو قلّ ودلّ ہو۔

آپ ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) بروز ہفتہ واصل الی اللہ ہوئے۔ قونیہ میں مولانا روم کا مزار مبارک آج تک زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

مولانا کے مرید معنوی علامہ محمد اقبالؒ فرماتے ہیں !

نہ اٹھا پھر کوئی رُومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں' وہی تبریز ہے ساقی

بشکریہ:۔
سوانح مولانا روم (شبلی نعمانی)

جس چیز سے مُحبت ہو اُس کے بارے میں سوچا نہیں کرتے۔ سوچ شُبہات پیدا کرتی ہے، اور شُبہ محبت کو ختم کر دیتا ہے۔

عمیرہ احمد (میری ذات ذرۂ بے نشاں)

''محبت''

عبدالرحمن (بی ای ٹی-۵)

چاہے اور چاہے جانے کی خواہش ہر ایک کے دل میں ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

محبت سچے جذبات اور احساسات کا نام ہے۔ یہ روح سے روح تک پہنچنے کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں بہت سے خوبصورت اور بہت سے دشوار موڑ آتے ہیں۔ کسی کی خوشی اور غم کو اپنا سمجھنے کا نام محبت ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو اس کی ہر بات ہمیں اپنی بات لگتی ہے۔ محبت میں کسی شخص کی برائی بھی اچھائی لگتی ہے۔ یہ جانتے، بوجھتے بھی کہ وہ شخص برا کر رہا ہے۔

خلوص محبت کی سچائی کو صرف وہی شخص جان سکتا ہے جو رشتوں کے خلوص سے آشنا ہو اور رشتوں کو نبھانا جانتا ہو کسی کا کیا خوب کہنا ہے کہ ''محبت ہمیں جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہے''۔ انسان ہمیشہ زندگی میں سکون کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ سکون اسے صرف سچی محبت ہی دے سکتی ہے۔ محبت اوروں کا احساس کرنا سکھاتی ہے اور جب احساس کسی رشتے سے جڑتا ہے تو وہ رشتہ محفوظ ہو جاتا ہے اسے ایک تحفظ مل جاتا ہے۔

ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں، جیسے آئینہ سامنے سے تو بہت حسین ہوتا ہے مگر اس کا دوسرا رُخ بھیانک بھی ہو سکتا ہے۔ محبت جتنی خوشی دیتی ہے اس سے زیادہ درد بھی دیتی ہے۔ رشتے تو کچے دھاگوں سے نازک ہوتے ہیں جب انسان کسی کو چاہتا ہے تو اپنے ارمانوں کو رشتوں کے دھاگوں میں پرو کر مالا بنالیتا ہے اور اگر کوئی بے دردی سے اس مالا کو توڑ دے تو سب موتی بکھر جاتے ہیں۔ جو انسان کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ محبت انسان کو توڑتی ضرور ہے مگر پھر سے جینا بھی سِکھاتی ہے۔ انسانیت کا سب سے بڑا نقصان انسانوں کی موت نہیں بلکہ ان کے باہمی رشتوں کا ختم ہو جانا ہے۔

بلاشبہ یہ ہمارے اندر بے چینیوں کو بڑھا دیتی ہے مگر ہماری روح کو سکون بھی یہی جذبہ دیتا ہے۔

بے شک انسان کی آنکھیں سب کچھ بیان کر دیتی ہیں لیکن محبت اظہار کے لفظوں کی محتاج ہمیشہ سے رہی ہے۔ تائید تازہ کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے چاہے یہ کتنی ہی پرانی اور مضبوط کیوں نہ ہو جائے۔

امجد اسلام امجدؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی ، جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو !

نگاہوں سے ٹپکتی ہو ' لہو میں جگمگاتی ہو !
ہزاروں طرح کے دلکش حسین ہالے بناتی ہو !
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

سچی محبت کبھی کسی کے ظاہری حُسن کی اسیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ محبت اس سے نہیں کی جاتی جو خوبصورت ہو بلکہ خوبصورت وہ ہوتا ہے، جس سے محبت ہو۔

رشتوں کی قدر جانیئے' لوگوں کو سمجھئے اور محبت کرنا سیکھیئے' انسانیت سے محبت کیجیئے' کیونکہ جو لوگ خود سے محبت کرتے ہیں وہ کبھی دوسروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور جو لوگوں سے محبت کرتے ہیں، انہیں اتنا پیار ملتا ہے کہ انہیں خود سے محبت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

محبت ان سے کیجیئے جو ہمیشہ آپ کی خوشی کا خیال کرتے ہیں' ہمیشہ آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوتے ہیں اور جن کو آپ سے بات کرنے کے لئے وقت کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی' انکا ہر لمحہ آپ کے لئے ہوتا ہے۔

خدیجہ طارق (بی ایس بی۔۴)



قائداعظمؒ کی شخصیت کے نمایاں پہلو

نورالعین (بی ای ایل۔۴)

مذہبی اور صوبائی عصبیت نہ صرف افراد کو مُنتشر کر دیتی ہے بلکہ کسی قوم کے داخلی ڈھانچہ کو بھی اس طرح بے ترتیب کر دیتی ہے کہ اس قوم کی ترقی اور خوشحالی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ہمیشہ مذہبی اور صوبائی عصبیت کی نفی کرتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو اس ہلاکت خیز عمل سے دور رکھیں اور ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر دنیا کے سامنے تہذیبی اور تمدنی حوالے سے ایک اعلیٰ مثال بن کر ابھریں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ نے نومولود مملکت ''پاکستان'' کے نشریاتی ادارے ''پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن'' کی افتتاحی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا!

''نئی مملکت کے قیام سے پاکستان کے عوام پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔ اب ان کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ دنیا کو دِکھا سکیں کہ ایک قوم جو بہت سے عناصر پر مشتمل ہے کس طرح امن و شانتی کے ساتھ نہ صرف زندہ رہ سکتی ہے بلکہ ذات پات اور عقیدے کے امتیاز کے بغیر عوام اور مملکت کی ترقی کے لئے کام کر سکتی ہے''۔

قوموں کے درمیان بڑی جنگیں اقتصادی حکمت عملی سے لڑی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے پاکستان قائم ہونے سے پہلے ہی مختلف تجارتی اور اقتصادی اداروں کی تشکیل شروع کر دی تھی۔ آپ نے مسلم ایوان ہائے تجارت قائم کئے۔ بینکوں کی بنیاد رکھی، فضائی کمپنی قائم کی اور جہازرانی کا ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ تمام اقدامات اس بات کی دلیل ہیں کہ قائداعظم پاکستان کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے قیامِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قوم کے نام ایک پیغام میں فرمایا ''قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے، آپ کے پاس غیر محدود وسائل ہیں، آپ کی مملکت کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اب اسکی تعمیر آپ کا کام ہے، لہٰذا اِس کی تعمیر کیجئے۔ جس قدر جلد اور عمدگی کے ساتھ آپ یہ کام کر سکتے ہیں کریں۔ آگے بڑھیئے میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں''

قائداعظم کو طالب علموں سے بہت محبت تھی۔ آپ اپنی سیاسی مصروفیات میں سے طالب علموں کے لئے ضرور وقت نکال کر ان سے خطاب کرتے اور ان کے اندر حصول علم کی لگن پیدا کرتے تھے۔ قائداعظم نے تحریک پاکستان کے دوران بھی طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو عملی سیاست سے دور رکھتے ہوئے صرف تعلیم حاصل کریں تا کہ وہ مستقبل میں ایک اچھے شہری بن سکیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے نام ایک پیغام میں فرمایا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مملکت کے مستقبل کا زیادہ دارومدار اس امر پر ہوگا کہ ہم اپنے بچوں یعنی مستقبل کے خدامِ پاکستان کو کس طرح تعلیم دیتے ہیں اور ان کی پرورش کس

طریقے سے کرتے ہیں۔ تعلیم کے معنی صرف کتابی تعلیم ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے کردار کی تعمیر بھی ضروری ہے۔"

کسی بھی مذہب و معاشرے میں خواتین کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ خواتین معاشرے کی تعمیر و ترقی میں برابر کا فرض ادا کرتی ہیں ۔تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مطالبۂ پاکستان کے فروغ کے لئے خواتین کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی خواتین سب کمیٹی قائم کی اور اس کمیٹی کا کنوینر اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو مقرر کیا۔ قائداعظمؒ کو اپنی اس کوشش میں بےمثال کامیابی حاصل ہوئی اور خواتین کی ایک بڑی تعداد تحریکِ پاکستان میں شامل ہوگئی۔ ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو قائداعظم نے صوبہ سرحد کے دورہ کے موقع پر خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "مجھے خوشی ہے کہ ہماری خواتین قومی جدوجہد کی راہ میں نکل آئی ہیں، لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے"۔

قائداعظم خواتین کو وہ مقام دلانا چاہتے تھے جس کی اسلامی حدود میں رہتے ہوئے خواتین کو اجازت دی گئی ہے۔

بانیٔ پاکستان کی حیات و خدمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ آپ اپنی سیاسی زندگی میں روزِ اول سے ہی ہر قسم کے ظلم، ناانصافی، تشدد اور دہشت گردی کے خلاف تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا پلیٹ فارم ہو یا انڈین لیجسلیٹو کونسل کا، وہ آل انڈیا مسلم لیگ کا پلیٹ فارم ہو یا انڈین ہوم رول لیگ کا، آپ نے ہر پلیٹ فارم سے نہ صرف ہندوستان کی حدود، بلکہ بین الاقوامی حدود میں ہونے والی ناانصافیاں، ظلم اور دہشت گردی کی کھلے الفاظ میں مذمت کی اور ان کے خاتمے کے لئے عملی اقدامات کیے ۱۹۰۴ء میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پہلی مرتبہ شرکت کی اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں روا مسلم املاک کے سلسلہ میں ہونے والی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی۔ بحیثیت رکن لیجسلیٹو کونسل اجلاس میں جب آپ نے پہلی مرتبہ شرکت کی تو اس اجلاس میں وائسرائے ہند، لارڈ منٹو نے قائداعظم کی تقریر میں استعمال ہونے والے ظالمانہ کے لفظ پر اعتراض کیا تو قائداعظم نے فرمایا "میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں، لیکن میں ایوان کے آداب و وقار سے بہتر طور پر واقف ہوں" ۱۹۱۲ء میں کونسل کے سامنے ابتدائی تعلیم کا بل پیش ہوا تو اس پر بھی تقریر کرتے ہوئے آپ نے حکومت کو باور کرایا کہ نہ صرف تعلیم حاصل کرنا ہر انسان کا حق ہے بلکہ بہتر تعلیم کے مواقع فراہم کرنا ہر حکومت کا فرض ہے۔

بانیٔ پاکستان نے اپنے کردار اور گفتار کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب میں جرأت اور حوصلے کا فولاد پگھلا کر بھر دیا تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران متعدد مواقع ایسے آئے جہاں مایوسی اور ناامیدی نے مسلمانوں کو گھیر لیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ تحریک پاکستان میں رخنہ پیدا ہو جائے گا، لیکن اس مرحلہ پر قائداعظم نے مخصوص لہجہ میں مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور تحریک پاکستان کے مخالفین کو للکار کر کہا۔۔۔ "پاکستان مسلمانوں کے لئے موت و زیست کا سوال بن چکا ہے اور وہ کسی بھی صورت میں مطالبۂ پاکستان سے دستبردار نہیں ہوں گے"۔

قائداعظمؒ نے ۳۰ اکتوبر۱۹۴۷ءکوریڈیوپاکستان لاہور سے اپنی ایک نشری تقریر میں بہت واضح طور پر فرمایا کہ اب پاکستان ایک نوشتہ تقدیر ہے اوراسے کبھی مٹایانہیں جاسکے گا۔اس دن لاہور کے یونیورسٹی اسٹیڈیم میں ایک جلسہء عام سے آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''موت سے مت ڈریئے' ہمارا مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ موت کا استقبال کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئیے' ہمیں پاکستان اوراسلام کے وقار کو بچانے کے لئے حالات کا مردانہ وارمقابلہ کرنا چاہئیے''۔

قائداعظمؒ چونکہ خودایک مایہ نازوکیل تھے اس لئے وہ قانون کی بالادستی کو بھی عزیز رکھتے تھے آپ کی سیاسی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ کسی ایک مرحلہ پر بھی آپ نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا۔آپ کہا کرتے تھے کہ قانون کو قانون سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔وہ آئینی جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔اسی لئے تشدد کی سیاست کی تائیدوحمایت نہیں کرتے تھے۔تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اورقیام پاکستان کے بعد بھی آپ نے تشدد کی سیاست سے بیزاری کا اظہار کیا اور بار بار عوام کو قانون کی پاسداری کا درس دیا

۱۱ اگست ۱۹۴۸ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔''ایک حکومت کا پہلا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان برقرار رکھے تاکہ مملکت اپنے عوام کی جان ومال اوران کے مذہبی عقائد کا مکمل طور پر تحفظ فراہم کرسکے۔''

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کوریڈیو پاکستان لاہور سے اپنی ایک نشری تقریر میں فرمایا۔''اب ہمیں اپنی عظیم قوم اوراپنی خودمختار مملکت کی تنظیم،تعمیرنو اور شیرازہ بندی کے لئے منصوبے بنانے چاہئیے۔جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت ہے۔اب ہر مسلم مرداورعورت کے لئے یہ وقت اور موقع ہے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کے لئے اپنا بہترین کردارادا کرے اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرے اورقومی خدمت کے لئے مسلسل اور بے لوث کام کرے اور پاکستان کودنیا کی عظیم ترین قوموں کی صف میں شامل کرے۔اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنا فرض کیسے نبھاتے ہیں۔ہمارے پاس بلاشبہ جوہرِ قابل موجود ہیں۔رب العزت نے ہمیں تمام قدرتی مال ودولت سے نوازا ہے۔اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اُسے احسن طریقے سے کام میں لائیں''اِس نشری تقریر میں آپؒ نے مزید فرمایا''اپنے اندر جوش وجذبہ پیدا کیجئے اوراپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے حوصلہ پیدا کیجئے اورامید کے ساتھ آگے بڑھیئے۔ہم ضرور کامیاب ہونگے۔ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہے کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ کام' کام اورصرف کام کریں اوراپنے نصب العین یعنی اتحادٗ ایمان اور تنظیم کو بھی فراموش نہ کریں۔

اِک نظریہ

محمد شہزاد اختر (بی ای ٹی-۲)

''آپ جو دیکھ رہے ہیں کیا وہ ویسا ہی ہے!''

جی ہاں کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں باقی لوگوں کو بھی وہ ویسا ہی نظر آ رہا ہے؟ آپ کا جواب ہوگا کہ یقیناً میں جس چیز کو جس رنگ میں دیکھ رہا ہوں باقی لوگوں کو بھی وہ ویسا ہی نظر آ رہا ہوگا اگر آپ کا جواب یہ ہے تو ایک مرتبہ پھر سوچیں۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ''ہر شخص دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے'' یہ بات محاورا تا بھی درست ہے اور حقیقتاً بھی۔ فرض کریں آپ کے سامنے ایک سرخ رنگ کی گیند پڑی ہے۔ اگر کوئی دوسرا انسان اسے دیکھے گا تو اسے بھی وہ سرخ ہی نظر آئے گی۔ بلکہ کلر بلائنڈ لوگوں کے علاوہ سب کو ہی وہ سرخ نظر آئے گی۔ مگر میرا نظریہ تو یہ ہے کہ ضروری نہیں وہ سرخ ہی ہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حقیقت میں وہ کیا ہے بلکہ ہم نے اسے ایک مشترکہ رنگ دے دیا ہے۔ اور چونکہ ہر رنگ ہر جگہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے لہذا ہم میں کبھی بھی اختلاف نہیں ہوا۔

کیا آپ کو میری بات سمجھ میں آئی؟ یقیناً نہیں آئی ہوگی۔ چلیں میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ فرض کریں کہ انسان نے ایک ایسا روبوٹ تیار کیا ہے جو رنگوں کی پہچان رکھتا ہے اور ہمیں بتا سکتا ہے کہ یہ رنگ کون سا ہے۔ ہم نے صرف ایک مرتبہ اس میں سارے رنگوں کی پہچان محفوظ کروائی ہے اب ہم نے دو روبوٹ لئے R1 اور R2 اور انکے سامنے گیند رکھی جو بقول ہمارے سفید رنگ کی ہے اب ہم ایسا کرتے ہیں کہ ان دونوں روبوٹس کے سرکٹس کے اندر ایسی تبدیلیاں کرتے ہیں کہ جب ہم R1 کے کیمرے سے لی گئی تصویر کو دیکھیں تو ہمیں وہ گیند سرخ نظر آئے اور R2 سے لی گئی تصویر میں گیند سبز نظر آئے۔ اب ہم ان دونوں روبوٹس کے اندر پروگرامنگ کرتے ہیں کہ ان کو گیند کا جو رنگ نظر آ رہا ہے وہ کالا ہے۔ اب R1 اور R2 اس رنگ کو جہاں بھی دیکھیں گے کالا ہی بتائیں گے۔ جبکہ ہمیں وہ گیند سفید نظر آ رہی ہے حالانکہ ایک کو وہ رنگ سبز نظر آ رہا ہے اور ایک کو سرخ مگر پھر بھی دونوں اسے کالا ہی بتا رہے ہیں اب وہ اسے جب بھی دیکھیں گے اس کا رنگ کالا ہی بتائیں گے چلیں یوں کہتے ہیں کہ انہوں نے الگ الگ رنگ میں اس گیند کو دیکھنے کے باوجود اسے ایک مشترکہ نام دے دیا ہے۔

یہ مثال تو تھی روبوٹس کے بارے میں۔ مگر چونکہ انسان کی کسی نے پروگرامنگ نہیں کی اس لئے اس نے اپنے لئے خود ہی یہ کام کیا کسی بھی چیز کو دیکھنے کے بعد ہر انسان اپنے دماغ میں اس کی اپنے طریقے سے پروسیسنگ کرتا ہے مگر چونکہ کسی بھی چیز کا جو بھی رنگ ہے وہ ہمیشہ ہر جگہ ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ اس لئے انسانوں کے درمیان کبھی اختلاف نہیں ہوا۔

مجھے یقین ہے یہ مثال پڑھنے کے بعد بہت سے حضرات میرا نقطہ نظر جان چکے ہوں گے اور بہت سے نہیں بھی۔ جو میرے نظریے کو ابھی

تک نہیں سمجھ سکے وہ ذرا خود ہی اس پر غور کریں شاید وہ بھی کل کو میرے حامی بن جائیں۔ جن لوگوں کو میری بات سمجھ میں آ گئی ہے وہ یقیناً سوچ میں پڑھ گئے ہوں گے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا جب یہ خیال میرے دماغ میں آیا۔

بنیادی سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ سورج کی روشنی میں جو سات رنگ موجود ہیں۔ جب وہ کسی بھی چیز پر پڑتے ہیں تو وہ چیز اپنی خصوصیات کے مطابق کچھ رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اور کچھ کو منعکس۔ اس طرح ہمیں اس کے رنگ کے بارے میں پتا چلتا ہے اور یوں وہ چیز ایک رنگ میں نظر آتی ہے میرا جواب یہ ہے کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے مگر جب کوئی بھی تصویر کسی شخص کے دماغ میں پہنچتی ہے تو ہر انسان اس کو اپنے انداز میں پروسیس کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر انسان اپنے انداز میں سوچتا ہے۔ چونکہ بچپن سے ہی اسے رنگوں کے ناموں کے بارے میں بتا دیا جاتا ہے لہذا اگر وہ کسی چیز کو سبز رنگ میں بھی دیکھتا ہے تو اسے سرخ بولتا ہے۔ کیونکہ اس کے ماں باپ نے اسے یہی بتایا ہوتا ہے کہ یہ چیز سرخ رنگ کی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہر انسان کے فنگر پرنٹ مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انسان کی شکل مختلف ہوتی ہے اور ہر انسان کی سوچ بھی مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے سوالات اس موضوع پر اٹھتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نظریہ بالکل ہی غلط ہو اور اس میں کچھ بھی حقیقت نہ ہو۔

اَج آکھاں وارث شاہ نوں ، کہ توں قبراں وچوں بول
تے اَج کتابِ عشق دا ، کوئی اگلا ورقا پھول

اِک روئی سی دھی پنجاب دی ، تُو لکھ لکھ مارے وَین
اَج لکھّاں دھیاں روندیاں ، تینوں وارث شاہ نوں ، کہن

اُٹھ درد منداں دیا دردیا ! اُٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وچھیاں ، تے لہو دی بھری چناب

(امرتا پریتم)

کامسیٹس چک شہزاد

سید محمد اویس علی (بی ای ٹی۔٦)

یوں تو ہر دفعہ ہی طویل عرصے کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی جانا گراں گزرتا تھا، لیکن ۴ مارچ ۲۰۰۸ء کو پریشانی کی حد ہی ہوگئی۔ دراصل میں گزشتہ دوراتیں اِس وجہ سے سو بھی نہیں سکا تھا۔ میرے بہت سے دوست اسی شش و پنج میں مبتلا ہوں گے کہ ۴ مارچ کو ہمارا نئے کیمپس میں پہلا دن تھا، تو جناب اسی بات کی تو پریشانی تھی۔ اب ایسا بھی نہیں کہ صرف پریشانی تھی، بلکہ دل کے کسی کونے میں نئی جگہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔ گھبراہٹ کی بڑی وجہ گھر سے یونیورسٹی کی دوری تھی۔

میں علی الصبح تیار ہو کر ایچ-۸ کیمپس روانہ ہوگیا جہاں سے ہم نے یونیورسٹی کی بسوں پر نئے کیمپس جانا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ بس ۱۵ منٹ بعد چلے گی۔ میری متلاشی نگاہیں بے صبری سے اپنے رفیقوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس پر ستم یہ کہ شناسا لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔

خیر بس کے قریب پُہنچا اور میں بھیڑ کا حصہ بن کر بس میں سوار ہوگیا۔ بیس منٹ کے بعد ہمارا نیا کیمپس آ گیا۔ دیکھتے ہی دل میں ایک خیال آیا۔

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

لیکن یہ گھر نہیں، یہ تو ہمارا نیا کیمپس ہے، ہمارا اپنا کیمپس۔۔۔ خیر یہاں بھی عجب سی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ وہاں موجود تمام سٹوڈنٹس، حتیٰ کہ اساتذہ بھی پوری عمارت سے آشنا ہونے اور اپنی جگہ تلاش کرنے میں مصروف تھے۔

ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا کہ چک شہزاد کیمپس میں بہت کچھ ہوگا، اب دیکھ بھی لیا۔ ایک کونے میں ہمارا کیفے ٹیریا تھا جسے دیکھ کر میں لمحے بھر کے لئے چونکا۔ ایسے موقعے پر نہ جانے آپ لوگوں نے کیا سوچا ہوگا، مگر مجھے تو ایک ہی بات سمجھ میں آئی۔

بقول شاعر۔

کہیں کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کبھی زمین تو کبھی آسماں نہیں ملتا

یہی حال ہمارے نئے کیفے ٹیریا کا تھا، جسے انتظامیہ نے زمین تو دے دی، مگر آسمان (چھت) ابھی تک نہیں دیا تھا۔ اتنے میں میرے چند

دوست بھی آگئے۔ میں نے دوستوں کو دیکھ کر اور کیفے ٹریا کو رب کی غنیمت جان کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ لیب (Lab) دیکھنے کا شوق ہوا، بلڈنگ کے اندر قدم رکھا۔ لیب کے قریب پہنچے تو معلوم پڑا کہ لیبز ابھی پوری طرح تیار نہیں۔ لہٰذا داخلہ ممنوع! خیر یہ تو پہلے دن کی بات ہے، یہ معاملہ تو کئی دن تک رہا۔ ہم نے اس بات کو مصلحت جانا اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ مصلحت کیا ہے آگے قدم بڑھا دیئے۔ باہر واپس نکلے تو بیٹھنے کو جگہ کہیں نہ ملی بڑی مشکل سے ایک کونے میں جا کے بیٹھ گئے۔

اقبال سے معذرت کے ساتھ

نہ کہیں کیمپس میں جگہ ملی، جو جگہ ملی تو کہاں ملی

خیر چھوڑیئے۔ ہم نے اپنے دل کو سمجھایا کہ ابھی کیمپس نیا ہے۔ تمام سہولتیں میسر آنے میں وقت تو لگے گا ناں۔۔۔!

وہ پہلا دن تو گزر گیا اور کئی نئی باتوں کا انکشاف ہوا، جن میں سب سے اہم بجلی کی آنکھ مچولی تھی جو کبھی روٹھ جائے تو بڑی مشکل سے مانتی تھی۔

خیر میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ ہر مشکل کے بعد راحت کا ملنا لکھا ہے، بشرطیکہ اس راحت کے حصول کے لئے کوشش بھی کی جائے۔ یہاں اِن باتوں کا ذکر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ نئے آنے والے ساتھی یہ جان سکیں کہ بڑی جدوجہد کی گئی اس کیمپس کے لئے۔ قریباً ایک ماہ تو یہی معاملہ رہا کہ بہت سے طلباء وطالبات صبح کو ایچ-۸ کیمپس آتے اور وہاں سے بسوں میں سوار ہو کر چک شہزاد کیمپس آتے اور واپسی کا یہی معمول ہوتا۔ مگر یہ سلسلہ بھی اچانک ختم ہو گیا جس سے صرف میں ہی نہیں بلکہ سٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد بُری طرح متاثر ہوئی۔ لہٰذا اس مشکل سے نہ چاہتے ہوئے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔

انسان کی زندگی میں کئی بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے اور سوائے سمجھوتہ کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں ملتا۔ شروع میں تو بہت کوشش کی گئی کہ شٹل سروس دوبارہ بحال ہو جائے لیکن بے سُود۔ اِن سب چیزوں پر سمجھوتہ کر لیا گیا مگر ایک اور بڑا مسئلہ ٹائم ٹیبل کا تھا، جو ہماری ننھی جانوں کے لئے وبال ثابت ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ خوشنما تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں جو ہمارے لئے خوش آئند ثابت ہوئیں۔

بقول شاعر

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

خلاصہء کلام یہ کہ اگر چہ یہ کیمپس ہمارے لئے محدود سہولیات رکھتا ہے، لیکن ہم اس بات سے قطع نظر اللہ تعالیٰ کے حضور شکر ادا کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمیں ایک بہترین ادارہ عطا ہوا۔ ہم اِس ادارے سے دِلی لگاؤ رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ دعا بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور یہ ادارہ آنے والے دنوں میں ایک مکمل ترقی یافتہ ادارہ ثابت ہو۔ ہم اِس ادارے کی ترقی کے لئے انتظامیہ کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ادارے کو ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

مُلاقات



زمانہء حاضر میں اصغر ندیم سیّد کے نام سے کون آشنا نہیں؟ انہوں نے ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ انہیں مُلکی اور غیر مُلکی ڈرامہ نگاروں سے مُمتاز کرتی ہیں۔ پاکستان ٹیلی وژن کے سُنہری دور میں ''چاند گرہن'' جیسا ڈرامہ لکھنے والے اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں اور کالمز کو نہ صرف پاکستان، بلکہ تمام خطے میں سراہا گیا اور آج بھی سراہا جاتا ہے۔

کامسیٹس اسلام آباد کے چوتھے شُمارے کے لیے مجلسِ ادارت نے گزشتہ دنوں اصغر ندیم سیّد کا انٹرویو کیا جو کہ یقیناً طلباء کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔

سوال نمبر 1: آپ کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میں پاکستان کے تاریخی شہر ملتان میں پیدا ہوا۔ عظمت واسطی روڈ پر ہمارا چھوٹا سا گھر تھا۔ میرے ددھیال کا تعلق خانپور کے ایک گاؤں سے تھا۔ وہاں پر زیادہ تر کھجور کے باغ تھے۔ اس قدرت سے قربت نے جو حساسیت اور قوت مشاہدہ عطا کی وہ تمام عمر میرا سرمایہء

افتخار رہی۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ وسائل کی کمی کے باوجود والد صاحب نے تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کئے اور سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دی۔ والد صاحب کی خصوصی توجہ کا نتیجہ تھا کہ ہم پانچوں بہن بھائیوں نے اچھی تعلیم حاصل کی اور اپنے اپنے شعبے میں نام اور مقام پیدا کیا۔

سوال نمبر 2: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جواب: ہمارے گاؤں میں سہولیات سے مبرّا ایک چھوٹا سا سرکاری سکول ہوا کرتا تھا۔ علم کے راہی ٹاٹ پر بیٹھ کر اپنی راہ کھوجتے تھے۔ دیگر سہولیات کی عدم موجودگی کے باوجود ہمیں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی کیونکہ ایسے سکولوں کا طرّہ امتیاز ان کے اساتذہ تھے جو طلباء کو ہر ممکن لگن توجہ اور پیار سے پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد میں میں ملتان کے "ملت ہائی سکول" میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک پرائیویٹ سکول تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ طلباء کی استعداد اور دلچسپی کو خوب چھان پھٹک کر داخلہ دیتے تھے، سو بہت کم طلباء کو وہاں کی تعلیم حاصل ہوتی۔ وہاں میرے سینئرز میں اداکار محمد علی بھی تھے جن سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ پر جب میں لاہور آیا تو علی بھائی سے پھر ملاقات ہوئی اور ہماری دوستی آخری وقت تک قائم رہی۔ ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن میرے ہم جماعت تھے۔ وہاں سے میٹرک کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج ملتان میں داخلہ لیا۔ وہ گورنمنٹ کالج ملتان کے سنہری دور کے آخری سال تھے جب ایمرسن کالج کی روایات کا عکس ابھی باقی تھا۔ وہاں کی تعلیم اور اساتذہ دونوں ہی لاجواب تھے۔ وہاں میرے ہم جماعتوں میں شامل تھے سپریم کورٹ کے جسٹس تصدق حسین جیلانی، نیول چیف افضل طاہر اور سمیع الرحمان جو کہ پاکستان کا سب سے بڑا فوٹوگرافر ہے۔ لہذا میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اتنی قابل اور نامور شخصیات کے ساتھ پڑھا۔



سوال نمبر 3:　ڈرامہ نگاری کب سے شروع کی اور پہلا ڈرامہ کون سا لکھا؟

جواب: کالج کے زمانے سے ہی میں نے "امروز" میں لکھنا شروع کر دیا تھا جو کہ ایک ترقی پسند اخبار تھا۔ مارشل لاء کے زمانے میں امروز کو بند کر دیا گیا اور مجھے بھی اس سے نسبت کی پاداش میں ملتان سے شکر گڑھ تبدیل کر دیا گیا۔ میں نے اپنا پہلا ڈرامہ ۱۹۸۰ء میں لکھا جو کہ ۱۴ اگست کے حوالے سے ایک خصوصی ڈرامہ تھا۔ اس میں اللہ نے مجھے خوب عزت دی اور لوگوں نے اس کو بہت سراہا۔ کنور آفتاب احمد، جی ایم پی ٹی وی نے خود اسے ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک اور خصوصی پلے عید کے حوالے سے کیا۔ پھر تین سال شکر گڑھ رہنے کے بعد ۱۹۸۲ء میں لاہور آ گیا جس کے بعد ڈراموں کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو گیا۔ پھر اخبارات میں لکھنے کا سلسلہ بھی چل نکلا لیکن جو ایک فخر مجھے ساری زندگی رہے گا وہ یہ کہ میں اس وقت پی ٹی وی کا حصہ تھا جب ہم پورے خطّے میں ڈراموں کے بے تاج بادشاہ تھے اور جو کچھ اس وقت تخلیق ہوا وہ آج تک ایک مثال ہے۔

سوال نمبر 4:　آپ نے اپنے اکثر ڈراموں میں ''وڈیرہ سسٹم'' کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تو آپ کس حد تک علامتی ڈراموں کے قائل ہیں؟

جواب: میرے نزدیک ہر ڈرامہ علامتی ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی نہ کسی معاشرتی طبقے کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن علامتی کرداروں کی جو روایت افسانے میں موجود ہے، ڈرامے میں بعینہٖ نہیں آ سکتی کیونکہ یہاں پر کہانی زیادہ اہم ہے۔ دیکھنے والا چاہتا ہے کہ تہہ در تہہ تفصیلات آشکار ہوتی رہیں لیکن پر بھی ڈرامہ علامتی ہے۔ جیسے "پیاس" میں میں نے ایک خان وڈیرہ دکھایا ہے تو وہ علامت ہے تمام وڈیروں کی کیونکہ وہ مجموعی طور پر ان کی سوچ کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو تین چار ڈرامے میں نے اس موضوع پر لکھے ہیں وہ اس لیئے کہ معاشرے کے بہت سارے مسائل کی جڑ یہ فیوڈل سسٹم ہے۔ آئندہ بھی اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو میں اس value system کو expose کروں گا۔

سوال نمبر 5:　انٹرنیشنل گلوبلائزیشن کے باوجود ہمیں آپ کے ڈراموں میں ایک معاشرتی انقلاب نظر آتا ہے۔ کیا آپ ان کے حامی ہیں؟

جواب: جی ہاں! میں تو کوشش ہی یہی کرتا ہوں کہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی لائی جائے۔ مثلاً جو میرا نیا ڈرامہ بن رہا ہے اس میں میں نے ایک پڑھی لکھی مڈل کلاس لڑکی کی مشکلات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسئلہ وہی ہے، تناظر جدید ہے۔ ہر اچھے لکھاری کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ معاشرے میں موجود کمی کو منظرِ عام پر لا کر اس کے تدارک کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ ڈرامے کے پاس چونکہ ایک بڑی

viewership موجود ہے اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ ڈرامہ اس مقصد کی تکمیل ے لئے کردار ادا کر سکتا ہے۔ سو میں اس کا حامی ہوں۔

سوال نمبر6: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اِس وقت پاکستانی معاشرے میں انقلاب کے کچھ اثرات موجود ہیں؟

جواب: اگر انقلاب سے آپ کی مراد یہ ہے کہ معاشرے میں یک لخت کوئی بڑی تبدیلی آ جائے جس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے کی بیشتر خرابیاں دور ہو جائیں اور امن و آشتی اور ترقی کا دور دورہ شروع ہو جائے تو میری ناقص رائے میں فی الحال ایسے کوئی اثرات نہیں ہیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ انقلاب صرف انہی معاشروں میں آتا ہے جہاں لوگوں کے دلوں میں انقلاب کی خواہش اور جستجو ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ انقلاب کے لئے تمام معاشرتی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ رائٹر اور گلشن فکر کے آبیار ایک سمت اور مقصد دیتے ہیں۔ طلبہ تنظیمیں، سوشل ورکرز، سیاسی کارکن، خواتین اور دیگر طبقے جب اس سمت میں چلتے ہوئے اس مقصد کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں تب ہی انقلاب آ سکتا ہے اور فی الوقت یہ محرّکات ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔



سوال نمبر7: آپ کے پسندیدہ کالم، ڈرامے یا ناپسندیدہ کالم، ڈرامے لکھنے میں آپ اپنا اُستاد کس شخصیت کو مانتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ استاد کوئی ایک نہیں ہوتا اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ "پورا زمانہ آپ کا استاد ہے" اور یہ نظریہ اسلام میں بھی ہے کہ "علم حاصل کرو، خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" تو اس کا مقصد چین جانا نہیں تھا بلکہ گھر سے نکلنا تھا، اور علم کی تلاش کرنی تھی۔ "جہاں سے بھی علم ملے لے لو" تو بعض اوقات ہم کسی واقعہ سے سیکھ رہے ہوتے ہیں، کبھی کسی کتاب سے سیکھ رہے ہوتے

ہیں، کبھی کسی دوست سے سیکھ رہے ہوتے ہیں، کبھی کسی بچے سے سیکھ رہے ہوتے ہیں یہ سب چیزیں ہماری استاد ہیں۔ یعنی جس سے سیکھو وہ استاد بن جاتا ہے تو اسی طرح سے میں بھی کسی ایک کو اپنا استاد نہیں کہہ سکتا۔

سوال نمبر 8: اس مقام تک پہنچنا ایک شعوری کاوش تھی یا کوئی خوشگوار حادثہ تھا؟

جواب: کوئی چیز خوشگوار حادثہ نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ محنت کرو تو میں تمہاری مدد کروں گا تو محنت ہی ایک راستہ ہے۔ اللہ کبھی کسی کو اٹھا کے کسی مقام پر نہیں بٹھا دیتا۔ وہ صرف موقع دیتا ہے۔ یہ بندے پر ہوتا ہے کہ وہ موقع سے کیسے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے صرف ایک پگڈنڈی ہے جسے محنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 9: آپ کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے، جہاں سے بہت بڑے بڑے فنکار نکلے، لیکن اب تک وہاں کسی اکیڈمی کا قیام عمل میں کیوں نہیں آیا؟ کیا وہاں کا ٹیلنٹ ضائع نہیں ہو رہا؟

جواب: جی ہاں! بالکل ضائع ہو رہا ہے۔ بلاشبہ یہاں ادب کی جڑ کافی مضبوط ہے۔ کئی اچھے لکھاری موجود ہیں لیکن سب لوگ جتنا بھی سیکھے، وہ اپنی کاوشوں اور محنت سے سیکھے۔ جتنے بھی فنکار آئے انہیں ریڈیو اور ٹیلی وژن نے پروان چڑھایا۔ انہوں نے کسی اکیڈمی یا انسٹیٹیوٹ سے کچھ نہیں سیکھا کیونکہ انہیں بدقسمتی سے کوئی ایسی اکیڈمی بنا کر ہی نہیں دی گئی جو ان کو پروان چڑھاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سے نہ صرف جنوبی پنجاب بلکہ پاکستان بھر کا ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ علم، ادب اور کلاہ کی آبیاری کیلئے اکیڈمیز بنائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سیکھنے کا موقع اور ہمارے ملک کا ٹیلنٹ اس طرح سے ضائع نہ ہو۔

سوال نمبر 10: انٹرنیٹ کے استعمال نے کتاب کی اہمیت کو کافی کم کر دیا ہے؟ مصنف اور پڑھنے والے کے درمیان فاصلہ بہت بڑھا دیا ہے۔ اس فاصلے کو کیسے کم کیا جائے؟

جواب: انٹرنیٹ کتاب کا متبادل ہرگز نہیں ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا، یہ امریکن سروے کہہ رہا ہے کہ انٹرنیٹ کے بے تحاشہ استعمال کے باوجود وہاں کتاب کی پبلشنگ کم نہیں ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور کتاب کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ انٹرنیٹ صرف ایک سہولت ہے جس سے ہم صرف معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ علم حاصل کرنا ہو تو کتاب ہی چاہئے۔ سو انٹرنیٹ کتاب کا متبادل نہیں ہے۔ جہاں تک فاصلے کی بات ہے تو یہ تو معاشروں پر منحصر ہے کہ وہ کتاب کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ امریکہ میں ایک پبلک سروس ٹی وی چینل ہے جو کوئی اشتہار نہیں چلاتا۔ وہ صرف اور صرف عطیات پر چلتا ہے اور پورا دن کتب پر تبصرے دکھاتا ہے۔ اور اسکی مقبولیت کسی عام چینل سے کم نہیں ہے۔ پاکستان کی مثال لیں۔ ایک صاحب نے مانسہرہ میں ایک لائبریری بنائی ہے جو صرف اور صرف لوگوں کی عطیہ کردہ

کتابوں سے قائم ہوئی۔ ایک مکمل لائبریری ہے جس سے کوئی بھی اپنی مرضی کی کتاب حاصل کر سکتا ہے۔ ہر یونیورسٹی، ہر سکول میں لائبریری ہے جس میں لاکھوں ایسی کتابیں موجود ہیں جو آج تک کسی نے نہیں پڑھیں۔ تو یہ کتاب سے دوری ہمارے اپنے اندر پڑھنے کی لگن ناپید ہونے کی وجہ سے ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج اگر کوئی شخص کسی کتاب کو واقع حاصل کرنا چاہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ناکام رہے۔ بات صرف اپنی چاہت کی ہے۔

سوال نمبر 12: اصغر ندیم سیّد کی وجہ ءشہرت ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری ہے۔ لیکن اصغر ندیم سیّد بطور ایک شاعر اُبھر کر سامنے کیوں نہیں آ سکا؟

جواب: اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو پیغام ڈرامے کے ذریعے دیا جا سکتا ہے وہ شاعری کے ذریعے اس قدر سرعت سے نہیں پہنچتا۔ سو لاشعوری طور پر میرا امیلان ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری کی طرف زیادہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہر انسان میں شاعری کی ایک Range ہوتی ہے۔ اقبال کے مقابلے میں غالب نے بہت کم شاعری کی ہے لیکن غالب کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کچھ شعراء پوری زندگی میں صرف ایک ہی کتاب لکھ پاتے ہیں تو کچھ کی کتب کی تعداد دو ہندسوں میں پہنچ جاتی ہے۔ سو میرے اندر جس قدر شاعری تھی اتنی میں نے کی۔ تقابل سے قطع نظری میں انڈیا میں شاعری کی وجہ سے زیادہ جانا جاتا ہوں۔

سوال نمبر 13: کیا آپ اپنی ادبی کاوشوں سے مطمئن ہیں؟

جواب: انسان اپنے کام سے کسی قدر مطمئن ہو ہی جاتا ہے چونکہ اس نے خود کیا ہوتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جس ملک میں ہم ہیں وہاں ہم کوئی اعلیٰ روایت قائم نہیں کر سکے۔ مجھے تو تب خوشی ہو گی جب ہمارے ملک میں ادب کے حوالے سے کوئی نوبل پرائز آئے، کوئی بوکر پرائز آئے۔ ہمارا ادب دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو۔ ہماری کوئی انٹرنیشنل Rating ہو کوئی Ranking ہو۔ ہمارا نام اور ہماری پہچان ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے لکھاری برے ہیں یا ان میں قابلیت کی کوئی کمی ہے۔ بلکہ ہمارے ملک کے ادارے کمزور ہیں۔ یہاں رائٹرز کو Support نہیں کیا جاتا، انہیں Fascilitate نہیں کیا جاتا۔ سرکار ان کے لئے کسی قسم کا incentive نہیں دیتی۔ تو کیا ہو گا۔ ایک قابل شخص اپنی ہی ذات میں خودکشی کر لے گا۔ زیادہ دور نہیں جاتے۔ ہمارے پڑوسی بھارت، ایران، بنگلہ دیش اور سری لنکا کا ادب باقاعدہ internationally چھپتا ہے۔ بھارت اور ایران میں اس سال نوبل اور بوکر پرائز آ چکے ہیں۔ بھارت میں آپ کو ہر شہر میں intellectuals کے لئے گیسٹ ہاؤس ملیں گے۔ مفت ٹرینیں چلتی ہیں تا کہ انکا ادیب اپنا خطہ دیکھے تو کیونکر وہ اپنا مقام نہیں بنائیں گے۔ یہاں کا ادیب تو کبھی اپنے محلے سے باہر نہیں گیا ہوتا۔

بہرحال میں مطمئن تب ہوں گا جب ہمارے ادیبوں کو کوئی ایسا پلیٹ فارم میسر آ جائے جسے استعمال کرتے ہوئے ساری دنیا میں اپنے ملک کی پہچان بن سکیں۔

ایک اکادمی ادبیات (Academy of Letters) تھی جس کا کام تھا کہ وہ ادب کی ترقی اور ادیبوں کو بہتر مواقع فراہم کرے۔ لیکن وہ سرکار کی خوشامد میں لگ گئی اور کتابیں چھاپنے کا ادارہ بن گئی۔ حالانکہ کتابیں چھاپنے کے لئے باقاعدہ پبلشر موجود ہیں۔

سوال نمبر 14: اکثر رائٹرز گورنمنٹ کے خلاف لکھتے ہیں۔ کیا کبھی آپ کو گورنمنٹ کے خلاف لکھتے ہوئے کسی دشواری کا سامنا ہوا؟

جواب: میں حکومت کے خلاف کبھی نہیں لکھتا۔ میں تو سسٹم کے خلاف لکھتا ہوں مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کے زرداری صاحب ہوں یا نواز شریف صاحب ہوں مجھے صرف اس بات کی پریشانی ہے کہ میرا ملک کسی کمزور سیاسی و سماجی نظام میں پھنسا ہوا ہے۔ اور اس پر لکھنا میرا بنیادی حق ہے جس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ ملازمت کرتے ہوئے کوئی اپنی سوچ اور اپنی فکر گروی نہیں رکھتا۔ میں نے اپنے ملک کے لئے اپنے سسٹم کے لئے اور اپنی عوام کے لئے جو بہتر سمجھا ہے وہی لکھا ہے اور وہی لکھتا رہوں گا۔

سوال نمبر 15: احمد فرازؔ کی وفات کے بعد دنیائے سخن میں ایک خلاء پیدا ہوا ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ نسل میں سے کوئی ایسا ہے جو اس خلاء کو پُر کر سکے گا؟

جواب: میری ایک بات یاد رکھیں۔ دنیا میں آج تک کوئی کسی کا خلاء پُر نہیں کر سکا۔ کیا غالبؔ کا خلاء پر ہوا؟ کیا اقبالؔ کا خلاء پر ہوا؟ نہیں ہوا! حتیٰ کہ کسی چھوٹے انسان کا بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ نے کائنات بنائی ہی اسی لئے ہے کہ ایک آئے تو ایک جائے گا، اور ہر انسان میں اللہ نے ایک الگ سے صلاحیت رکھی ہے جو دوسرے انسان میں نہیں۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ کوئی کسی کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی اپنا رول ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ میں بھی چلا جاؤں گا اور میری جگہ کوئی اور باصلاحیت انسان آ جائے گا۔ لہذا کوئی کسی کو خلاء پُر نہیں کر سکتا۔

سوال نمبر 16: آپ کا پسندیدہ شعر کون سا ہے؟

جواب: ایک شعر مجھے بہت پسند ہے!

تھی وہ ایک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

اس کے علاوہ منیؔر نیازی کی کچھ شاعری جو مجھے بہت پسند ہے:

اِک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مُجھ کو
میں ایک اور دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

منیؔر اس مُلک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے؟
کہ حرکت ہے تیز تر اور سفر آہستہ آہستہ

اِس شہرِ سنگ دِل کو جلا دینا چاہیئے
ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اِک حشر اس زمیں پہ اُٹھا دینا چاہیئے

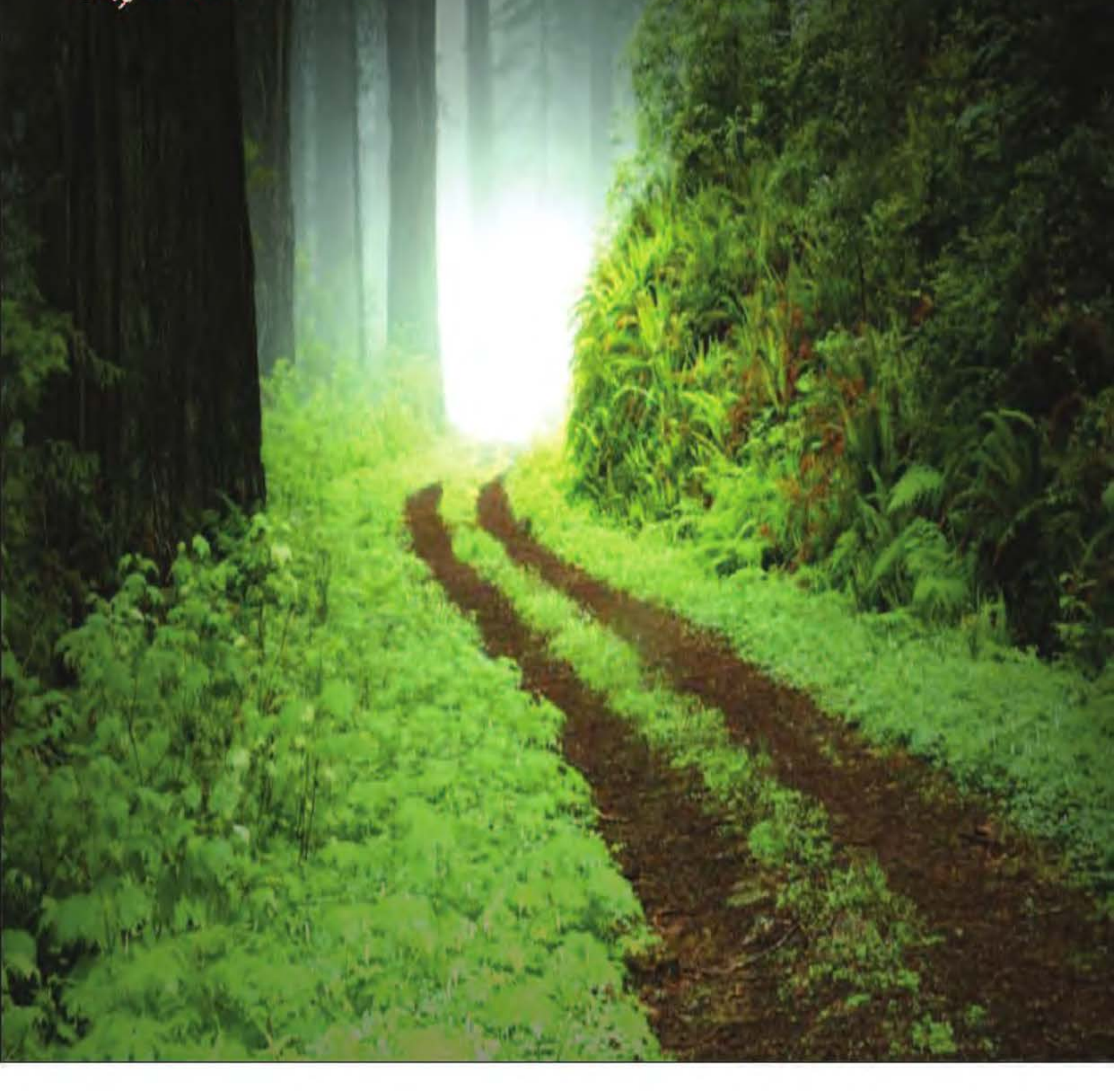
سوال نمبر 17: آپ طلباء کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: میں یہی کہنا چاہوں گا کہ آپ نے ڈرنا کسی سے نہیں ہے اور نہ ہی کبھی احساس کمتری کا شکار ہونا ہے۔ محنت کریں، صرف کلاس کے مطالعے کو ہی کافی نہ سمجھیں بلکہ مزید کتابیں بھی پڑھیں تا کہ علم میں اضافہ ہو، اچھی صحبت میں رہیں۔ اساتذہ کی عزت کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی تاریخ کو نہ بھولیں کیونکہ تاریخ ہی سب سے بڑا معلم ہے۔


خواب دریچے

زندگی میں ہم کبھی نہ کبھی اُس مقام پر آجاتے ہیں' جہاں سارے رشتے ختم ہوجاتے ہیں۔ وہاں صرف ہم ہوتے ہیں اور اللہ ہوتا ہے۔ کوئی ماں باپ، کوئی بہن بھائی، کوئی دوست نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے پیروں تلے کوئی زمین ہے نہ سر پر آسمان' بس صرف ایک اللہ ہی ہے جو اس خلا میں بھی ہمیں تھامے ہوئے ہے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ ہم زمین پر پڑی مٹی کے ڈھیر میں ایک ذرے یا درخت پر لگے ایک پتے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہونے یا نہ ہونے سے صرف ہمیں فرق پڑتا ہے' صرف ہمارا کردار ختم ہوجاتا ہے۔ کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' کسی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا' پھر ہماری عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔

(عمیرہ احمد۔ پیرِ کامل)



کہی اَن کہی

سید نبیل حسن (مدیر اعلیٰ)

میں نے دن رات خدا سے یہ دعا مانگی تھی
کوئی آہٹ نہ ہو در پہ مرے اور تُو آئے

انہہ انہہ!!!

یہ کس سے باتیں ہو رہی ہیں جناب!

اچانک سے جو دیا کی آواز میرے کانوں تک پہنچی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ جیسے میری دعا واقعی پوری ہو گئی ہو۔ اور اسی سرخوشی کے عالم میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا، دیا اپنی منفرد و معصوم مسکراہٹ کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہے۔ میں نے ذرا مزید آنکھیں پھاڑ کے اس کی طرف دیکھا تا کہ یقین ہو سکے کہ وہ واقعی موجود ہے یا میرا تصور اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ اُس کی بولتی تصویر بنا سکتا ہے۔ ابھی میں اسی تذبذب کا شکار تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''لگتا ہے تم کوئی خواب دیکھ رہے تھے میں نے بے جا ہی تمہیں جگا دیا۔ چلتی ہوں''

میں اسے اتنی جلدی کیسے جانے دیتا۔ جھٹ سے بولا ''نہیں نہیں میں سو نہیں رہا تھا، یہ کتاب لایا تھا وہی پڑھ رہا تھا۔''

اپنے یاقوتی ہونٹوں کو ایک کامل دائرے کی شکل دے کر اس نے ایک طویل 'اووو' کہا اور مسکرا کر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا

''تو آپ آنکھیں بند کر کے بھی پڑھ لیتے ہیں؟''

''نہ صرف آنکھیں کھولے بغیر پڑھ سکتا ہوں بلکہ کسی کے کہے بغیر سن بھی سکتا ہوں''

''اچھا جی! تو اس وقت کیا سن رہے ہو؟''

''اس وقت؟''

''ہاں اس وقت!''

''اس وقت میں سن رہا ہوں'' اچانک سے امی کی آواز آئی ''دیا، ارمان بیٹا نیچے آؤ، ہم چائے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں فوراً بولا: ''ہاں تو اس وقت میں سن رہا ہوں چائے کی آواز۔۔۔ وہ کہہ رہی ہے: ''ارمان! جلدی سے دیا کو لے کر نیچے آؤ اور مجھے پی جاؤ ورنہ میں ٹھنڈی ہو جاؤں گی اور تمہاری امّی کی محنت ضائع ہو جائے گی۔'' اور میں نے بھی اسے کہہ دیا ہے کہ اے چائے! ہم اپنی امّی کی محنت کسی قیمت پر ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ چاہے اس کیلئے ہمیں تجھے پینا ہی کیوں نہ پڑ جائے۔۔۔ تو

چلیں!''

اور وہ کھلکھلا کے ہنس دی اور میں چپ ہو گیا۔ وہ جب بھی ایسے ہنستی، میں دم بخود ہو جاتا تھا۔ اس کی ہنسی میں نہ جانے کیسی قوت تھی۔ اس قدر طاقتور اور پُر جوش ہنسی میں نے کبھی کسی اور کے لبوں پر نہیں دیکھی تھی۔ ایسی ہنسی جس میں آنکھیں لبوں کا پورا پورا ساتھ دیتی ہوں۔ اس کی ہنسی میں جھرنوں کا ترنم تھا، کانچ کی کھنک تھی، بکھرتی ہوئی دھنک تھی، وہ جب ہنستی تھی تو میں صبحِ صادق کے وقت پہنچ جاتا، جہاں ابھرتا ہوا سورج میرے اعتماد اور یقین کو ساتھ لیئے اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جاتا۔ بادِ صبا اپنی خوش خرامی کے ساتھ میرے اندر خنک و گداز احساسات جگاتی، چٹکتی کلیاں، مہکتی خوشبو اور جھلملاتی اوس یہ سب میرے وجود کو اتنا معطر کر دیتے کہ میری شخصیت ہی بدل جاتی، میں اپنے احساسِ الفت کی اور بھی قدر کرنے لگتا اور اپنی قسمت پر رشک بھی کہ مجھے دیا جیسی لڑکی کی محبت ملی۔ مجھے لگتا دیا انسانی روپ میں ہما ہے جس کا سایہ مجھ پر پڑتے ہی مجھے مملکتِ محبت کی بادشاہت مل گئی ہے

لیکن اپنے تمام تر احساسات اور جذبات کے باوجود میں نے ایک بار بھی دیا کو یہ نہیں کہا کہ ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' گو کہ میں اپنے ہر فعل سے اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا اور مجھے یقین تھا کہ نہ صرف اسے میری محبت کے بارے میں معلوم ہے بلکہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ پانچ الفاظ ''مجھے تم سے محبت ہے'' مجھ سے کبھی نہ کہے گئے اور نہ ہی کبھی اس نے کہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں پوری طرح سے اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ طائرِ محبت کی پرواز الفاظ کے آسمان سے اوپر ہوتی ہے۔ جذبات کو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا پیغام خود پہنچا لیتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے کہ سورج نکلے تو دن ہوتا ہے اور ڈوب جائے تو رات۔ جب اتنی چھوٹی سی مادی حقیقت بتائے بنا بھی حقیقت رہتی ہے اور سب کو معلوم بھی ہے تو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کسی کا یہ قول بھی میں نے پڑھ رکھا تھا کہ ''یہ کائنات جس مادے سے بنی ہے اس کا نام محبت ہے'' تو پھر میں ایسے عظیم جذبے کو الفاظ کی گدڑی کیسے پہناتا؟ نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا تھا، اور نہ ہی میں نے کیا۔ مگر اظہار بذریعہ عمل میں میں نے کبھی کوتاہی بھی نہیں کی اور نہ ہی اس نے۔ جس طرح مجھے اس کی سالگرہ، اس کے امی ابو کی سالگرہ، اس کے گھر کی ہر تقریب، اس کے پیپرز کی ڈیٹ شیٹ، ڈے آف ڈیکلریشن آف ریزلٹس وغیرہ یاد رہتے اسی طرح اُسے بھی یاد رہتے۔ جس طرح میں اسے ہمیشہ لک وِش کرتا، وہ بھی کرتی۔

جب بھی کوئی بیمار ہوتا تو دوسرا پھول یا کم از کم گیٹ ویل سون کا کارڈ ضرور لاتا۔ اور یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں تھی، ہم بچپن سے ایسا کر رہے تھے۔ میں وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں جب آفتاب انکل پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے۔ جب ہم دونوں پہلی بار ملے تھے۔ اسی کے بعد سے آج تک ہم نے ایک بھی دن ایسا نہیں گزارا جب ہم نہ ملے ہوں۔ جب ہم نے بات نہ کی ہو بلکہ

یوں کہنا چاہیئے کہ ہم اس شعر کی حسین ترین تعبیر تھے

بس گئی میرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں ، تیری خوشبو آئے

اور یہ کوئی یکطرفہ بات نہیں تھی ہم دونوں میں محبت کی مہک بسی ہوئی تھی۔ ہماری ہر ادا، ہر روش میں دوسرے کا عکس نظر آتا تھا۔ ہماری عادتیں اور پسند ناپسند نا قابل یقین حد تک ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ جو میرے پسندیدہ رنگ تھے وہی اسے بھی پسند تھے۔ مجھے گلاب اور موتیئے کے پھول پسند تھے اسے بھی وہی پسند تھے۔ جیسے مجھے بارش میں کشش محسوس ہوتی تھی اسی طرح اسے بھی ہوتی۔ جیسے مجھے گھومنے پھرنے اور قدرت کے حسین مناظر دیکھنے کا شوق تھا اسے بھی تھا۔ غرضیکہ ہمارا جوڑا کمال کا تھا۔

یہ بے مثال جوڑا کسی فلم کی طرح ظالم سماج سے نبرد آزما بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں خاندان نہایت ہی سلجھے ہوئے اور بامروت واقع ہوئے تھے اور نہ ہی محبت کی تکون کا نظریہ ہماری زندگیوں کے لیئے موزوں تھا۔ کیونکہ یہاں کوئی رقیبِ روسیاہ تھا ہی نہیں۔

میرے ماسٹرز کے فائنل EXAMS ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ بعد میرا رزلٹ آنے والا تھا۔ اس کے بعد میں نے جاب شروع کرنی تھی اور پہلی تنخواہ ملتے ہی امی ابو کو رشتہ لے کر دیا کے گھر بھیج دینا تھا۔ نہ کوئی مسئلہ نہ مشکل۔ امی ابو کو منانے کیلیئے بھی کوئی محنت نہ کرنی پڑتی کیونکہ دیا انہیں بہت پسند تھی اور دیا کے امی ابو تو جیسے تیار بیٹھے تھے۔ سب کچھ بہت رکا ہوا سا لگتا تھا، بہت پر سکون جیسے ٹھہرا ہوا سمندر۔۔۔ سمندر اور انسانی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ جب سمندر کی طرح انسانی زندگی میں بھی سب کچھ بہت پر سکون، بہت رکا ہوا بہت ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے تو یہ کسی نہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو تجربے کی بات ہے۔ ابھی ہماری عمریں ہی کیا تھیں جو اس قسم کے نتائج اخذ کرسکتیں۔ ویسے بھی جوش جوانی میں ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ لیکن یاد رہنے نہ رہنے سے کوئی فرق بھی تو نہیں پڑتا۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ اور ہوا۔۔۔

رزلٹ آنے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا آنکھیں بند کیئے ایک غزل پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے یہ شعر ختم کیا

میں نے دن رات خدا سے یہ دعا مانگی تھی
کوئی آہٹ نہ ہو در پہ مرے اور تُو آئے

انہہ انہہ کی آواز آئی اور دیا مسکراتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کیلیئے کہا لیکن وہ بہت جلدی میں

معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی: ''آج میں تمہارے لیئے ایک خوشخبری لائی ہوں، بوجھوتو کیا ہے؟'' ''تمھاری فزکس کی ٹیچر یونیورسٹی چھوڑ گئی ہیں'' ''نہیں'' ''تو پھر وہ جو پچھلے ہفتے تمہارا بریسلیٹ گم ہوگیا تھا ناں! وہ مل گیا ہے۔'' ''نہ! یہ بھی نہیں ہوا'' ''یہ بھی نہیں۔۔۔تو چلو تم خود ہی بتا دو کیونکہ خوشخبری بتانے میں زیادہ دیر نہیں لگانی چاہیئے، اچھی بات نہیں ہوتی ناں!'' ''یہ ہے خوشخبری۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔ میں نے کہا ''شادی کا کارڈ! کس کی شادی ہو رہی ہے بھئی؟''

''میری! پچھلے مہینے میرے ماموں کا بیٹا فہد آیا تھا ناں انگلینڈ سے، اُس کے ساتھ۔ ایک ہفتہ پہلے ماموں نے ابو سے بات کی، ابو نے رشتہ منظور کرلیا۔ امّی تو اُسی وقت مٹھائی لے کر آنا چاہتی تھیں لیکن میں نے منع کر دیا کہ یہ خوشخبری ارمان کو میں خود سناؤں گی، جب کارڈ آ جائیں گے۔ ابھی ابھی کارڈ آئے ہیں، سب سے پہلے تمہارا نام لکھ کر تمہارے لیئے لائی ہوں، مزے کی بات ہے نا! چٹ منگنی پٹ بیاہ، ایک ہفتہ بعد منگنی اور ایک مہینے بعد شادی۔ سنو! فہد اچھا ہے نا! مجھے ایسے ہی لڑکے پسند ہیں، کم بولنے والے، کم کھانے والے، کم سونے والے۔

''اس کی آنکھیں بھی ہیں سونے والوں کی طرح، جاگنے والوں جیسی''

پتہ ہے کل اس نے مجھے فون کیا۔ اُس سے بات کر کے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور اس سے بات کرتے ہوئے پہلی بار مجھے بھی محبت کا احساس ہوا۔۔۔

اچھا اب جلدی سے چلو! امّی اور آنٹی انتظار کررہے ہوں گے۔ ہم نے شاپنگ پہ جانا ہے۔ جلدی آؤ' یہ کہہ کر وہ جانے کی لیئے پلٹی۔

میں جو بڑی دیر سے دمبخود بیٹھا تھا، بڑی مشکل سے بولا: ''دی۔۔۔آ۔۔۔۔دیا یہ۔۔۔ یہ کیسا مذاق ہے؟ میں۔۔۔تم کو۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو دیا؟ کیا آج سے پہلے۔۔۔میرا مطلب ہے کل فہد کے فون سے پہلے تمہیں کبھی محبت کا احساس نہیں ہوا؟ وہ دن یاد ہے تمہیں۔۔۔۲۵ جولائی، جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ جب تم پہلی بار اس گھر میں آئی تھیں۔ اس کے بعد سے آج تک۔۔۔۔ آج تک ایسا کون سا دن گزرا ہے جب میں نے تمہیں محبت کا احساس نہ دلایا ہو؟ تمہیں احساس دلانے کا کوئی ایک بھی موقع جو میں نے جانے دیا ہو؟ دیا تب سے لے کر اب تک، زندگی کے بیس برس ہم نے اکٹھے بِتائے ہیں۔ میں کیسے مان لوں کہ ان بیس برسوں میں تمہیں ایک بار بھی میری محبت کا احساس نہیں ہوا۔۔۔ ایک بار بھی۔ اور وہ احساسِ محبت جو تم مجھے ہر قدم پر دلاتی رہی ہو۔۔۔ اُس کو کیا نام دو گی؟

''ارمان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس محبت کی بات کررہے ہو؟ تم نے تو مجھ سے آج تک ایک بار بھی نہیں کہا۔ ارمان یہ پانچ

الفاظ (مجھے تم سے محبت ہے)! یہ پانچ الفاظ کہنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ لیکن تم نے تو کبھی اپنے ہونٹوں کو اس کی لیئے جنبش نہ دی۔ یہ پانچ الفاظ کب کہے تم نے ارمان؟ کب؟؟؟''

''لیکن دیا تم تو جانتی ہو کہ محبت کی پرواز الفاظ کے آسمان سے اوپر ہوتی ہے۔ جذبات کو الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ احساسات تو کبھی الفاظ کے اندر لپیٹ کر پارسل نہیں کیئے جا سکتے اور میں تو پختہ یقین رکھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور جب ایسا نہیں ہوسکتا تو کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو سمجھنے کی بات ہے نا!''

''ارمان یہ تم سے کس نے کہا کہ محبت بتائے بنا بھی معلوم ہوسکتی ہے؟ محبت کو اظہار کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ ہر جذبہ جو دل ہی دل میں رہے بے معنی اور بے حقیقت رہتا ہے۔ نہ نظر آتا ہے نہ ہی پرکھا جاسکتا ہے۔ بے مزہ، بے بو اور بے رنگ، نہ سرد نہ ہی گرم، جس کو ان پانچ حسّیات کے ساتھ جاننا تقریباً ناممکن ہے۔ ویسے بھی یہ سراسر تمہاری غلطی ہے۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو کم از کم مجھے تو بتانا چاہیئے تھا۔ ہم اتنے اچھے دوست تھے۔ دنیا جہان کے مسائل پر بحث کرتے تھے، اس مسئلے پر بھی کر لیتے۔ ایک بار مجھ سے بات کی ہوتی تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ اب کیا ہوسکتا ہے؟ تاریخ طے ہے۔ ایک ہفتہ بعد منگنی ہے اور ایک مہینے بعد شادی، کارڈز چھپ کے آگئے ہیں۔ ہوٹل بک ہوگئے ہیں۔۔۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا ارمان۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔''

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ اسی وقت میرے سینے میں شدید درد کا احساس ہوا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ صرف دور جاتی ہوئی دیا دکھائی دے رہی تھی۔ اور جیسے ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ گھپ اندھیرا۔۔۔

بعد میں امّی نے بتایا کہ: ''اِس کے بعد دیا نے تمہاری کراہ کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے تمہارے پاس گئی تو دیکھا تم بے ہوش پڑھے ہو۔ وہ تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی اور ساتھ ہی اس نے مجھے آواز دی۔ میں جلدی سے اوپر گئی تو تمہاری حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ تمہیں جلدی سے ہسپتال لے جایا گیا جہاں تمہیں فوراً انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کردیا گیا۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ تمہیں دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور تمہارے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ وہ لوگ اپنی کوشش کر رہے ہیں، ہم دعا کریں۔'' تین گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر سے باہر آئے اور بتایا کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے لیکن دورہ بہت شدید تھا اور تم قومے میں چلے گئے ہو۔''

بیس دن میں قومے کی حالت میں رہا، مشینوں پر زندہ رہنے کا تجربہ بھی خوب تھا۔ نہ میں اُٹھ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا، نہ کھا سکتا تھا، نہ پی سکتا تھا، حتیٰ کہ بولنے اور دیکھنے سے بھی محروم تھا۔ ان بیس دنوں میں میرے خاندان کے کسی فرد کو میرے کمرے میں آنے

کی اجازت نہ تھی۔ صرف ڈاکٹر اور نرسیں میری دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ باقی لوگ دروازے میں موجود شیشے سے مجھے دیکھ سکتے تھے۔ بیس دن تک میرے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے آخر بیسویں دن ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ میری حِس سماعت سلامت ہے۔ ڈاکٹروں نے میری فیملی کو بتایا کہ ''دل کے دورے کی بظاہر کوئی جسمانی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس لیئے عین ممکن ہے کہ کوئی شدید جذباتی دھچکا اس دورے کا سبب بنا ہو۔ قوما کی STAGE ایک بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ اِس میں دنیا کا کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا۔ نتیجہ قطعی طور پر ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیئے میں آپ لوگوں کو ہر طرح کے نتیجے کیلیئے تیار رہنے کا مشورہ دوں گا۔'' یہ سن کر میری امی رونے لگیں تو دوسرا ڈاکٹر بولا ''دیکھیں رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ لوگ دعا کریں، شاید کوئی معجزہ ہی ہو جائے۔ اور کسی معجزے کے علاوہ ہماری آخری امید ارمان کی حسِ سماعت ہے جس کے بارے میں ہمیں آج ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ صحیح سلامت ہے۔ ہمارا تجزیہ یہ کہتا ہے کہ ارمان کو اٹیک کسی EMOTIONAL TENSION کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ہم الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے اس کی حسِ سماعت کو استعمال کریں اور کسی طرح اس کی یہ TENSION دور کر سکیں تو بہتری کی امید ہے۔ اب EMOTIONAL TENSION کیا تھی اور اسے کیسے دور کرنا ہے؟ یہ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔''

آج اکیسویں دن، پہلی مرتبہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے علاوہ کسی کو میرے کمرے میں آنے کی اجازت ملی تھی۔

کھڑک کھڑ ڑڑ۔۔۔۔۔۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کوئی دھیمے قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ پھر ایک آواز اُبھری۔۔۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔۔۔۔

دیا کی آواز۔۔۔۔ وہ بولی:

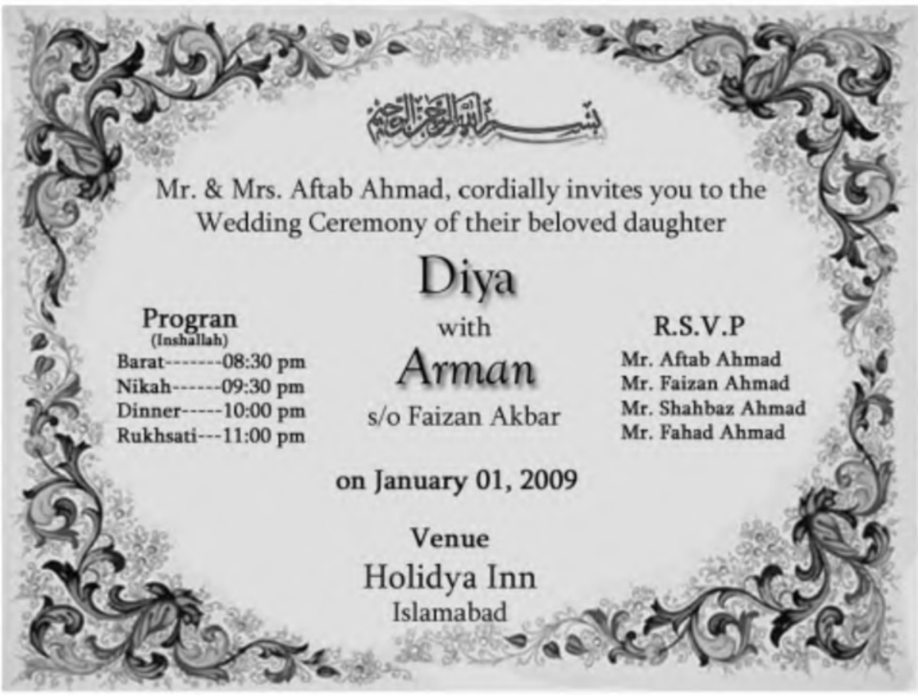
''ارمان!۔۔۔ میں بہت بری ہوں نا ارمان۔۔۔ تمہارا پیار بھرا دل توڑ دیا میں نے۔۔۔ وہ جس کو بہت سنبھال کے رکھنا تھا، چھوڑ دیا میں نے۔۔۔ میں بہت بری ہوں نا ارمان۔۔۔ یا شاید میں اس تحفے کے لائق ہی نہیں تھی۔۔۔ تمہارا معصوم سا دل سنبھال نہ سکی میں۔۔۔ ارمان اِن بیس دنوں میں بیس برسوں کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے۔۔۔۔ تمہیں یاد ہے ارمان! میرا رونا تمہیں بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن آج! ارمان آج میرے آنسو میرے قابو میں نہیں ہیں۔۔۔ دیکھو۔۔۔ وہ آنسو جنہیں تم موتی کہتے تھے اور کبھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے۔۔۔ دیکھو وہ کیسے مٹی میں مل رہے ہیں'' پھر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی: ''ارمان اُٹھو نا! ارمان پلیز اُٹھ جاؤ۔۔۔ تم نے تو کبھی میری بات نہیں ٹالی۔۔۔ آج یہ آخری بات مان لو۔۔۔ ارمان! اُٹھو نا ارمان! ورنہ آج یہ دیا بجھ جائے گا۔''

اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انساں کیا
مدتوں بعد مری آنکھوں میں آنسو آئے

اگر اسطرح وہ مجھے آکاش سے بھی بلاتی تو میں آجاتا۔ یہ تو صرف قوما تھا سو میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ۔ اس کے بعد میں نے صحت کی سڑک پکڑ لی اور حیرت انگیز ریکوری کی۔

صرف پانچ دن کے اندر میں مکمل طور پر صحت یاب ہو کے گھر آگیا۔ یہ پانچ دن دیا نے میرے ساتھ گزارے اور میرا اتنا خیال رکھا کہ مجھے مجبوراً ٹھیک ہونا پڑا۔ اس دوران ہماری پانچ الفاظ یا کارڈ پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ جس دن میں گھر آیا اس سے اگلے دن دیا میرے پاس آئی اور بولی: ''ارمان مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے لیکن تم وعدہ کرو کے ٹھنڈے دل و دماغ سے سنو گے۔'' میں نے کہا: ''فکر نہ کرو۔۔۔ اگر اب دورہ پڑا تو فیصلہ کرنے میں بیس دن نہیں لگاؤں گا۔'' اس نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''خبردار جو آئندہ ایسی بات کی۔'' میں کیا کرتا۔۔۔ چپ ہونا پڑا۔

اُس نے وہی کارڈ مجھے پکڑایا اور بولی: ''اِس کو آرام اور اطمینان کے ساتھ پڑھو اور پھر مجھے اپنا فیصلہ سُنا دینا۔'' کارڈ پڑھ کے جو میری حالت ہوئی اُسے جاننے کیلئے آپ کا کارڈ پڑھنا بہت ضروری ہے۔ سو پڑھیئے !!!


بسم اللہ الرحمن الرحیم

Mr. & Mrs. Aftab Ahmad, cordially invites you to the
Wedding Ceremony of their beloved daughter

Diya
with
Arman
s/o Faizan Akbar

Progran
(Inshallah)
Barat-------08:30 pm
Nikah------09:30 pm
Dinner-----10:00 pm
Rukhsati---11:00 pm

R.S.V.P
Mr. Aftab Ahmad
Mr. Faizan Ahmad
Mr. Shahbaz Ahmad
Mr. Fahad Ahmad

on January 01, 2009

Venue
Holidya Inn
Islamabad

امی، ابو اور دیا رزلٹ والے دن مجھے کوئی سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ میرے خیال کے عین مطابق وہ میری پسند سے واقف تھے، سو اُنہوں

نے دیا کے والدین سے بات کی ۔ رزلٹ والے دن منگنی اور ٹھیک ایک مہینے بعد شادی کا منصوبہ طے ہوگیا۔ لیکن پھر بھی مجھے بتانا ضروری تھا اورِاس اہم فریضے کی بجا آوری کیلئے دیا کا انتخاب کیا گیا۔ کارڈ کا طریقہ اس کا اپنا تھا لیکن میری بے وقوفی پر اُسے ایک شرارت سوجھی اور اُس نے کہانی گھڑ ڈالی۔

بہر حال، جو ہونا تھا وہ تو ہوا۔ وقت کی کمی اور تیاریوں کی زیادتی کے باوجود ہماری شادی وقت معیّنہ پر بخیر و عافیت انجام پائی۔ جس میں فہد نے شہبالے کی حیثیت سے شرکت کی ۔ اور اس طرح سمندر والی تھیوری بھی ہماری زندگیاں پہچاننے میں ناکام رہی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی اس قدر متنوّع، گونا گوں اور کثیر الجہات ہے کہ کوئی بھی مفروضہ اس کی صحیح توجیہ پیش نہیں کرسکتا۔ آج ہماری شادی کو پینتیس سال ہو گئے ہیں لیکن یہ 'پانچ الفاظ' والا سبق میں آج تک نہیں بھولا۔ روز صبح، دوپہر، شام "مجھے تم سے محبت ہے" کی گولی اُسے کھلا کر خود ڈھیر سارا پانی پی کر اِس نسخے پر پابندی سے عمل پیرا ہوں ۔۔۔

سامعہ اکبر (بی بی اے۔۸)



- VIRUS RELOADED
- LAB COMPUTERS

یہ معاملہ کوئی اور ہے

حنا مستور (بی بی اے۔۷)

اے ابن آدم! ایک تیری چاہت ہے
اور ایک میری چاہت ہے
پر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے
بس اگر تو نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا اس کے
جو میری چاہت ہے
تو میں بخش دوں گا تجھ کو وہ بھی
جو تیری چاہت ہے
پھر وہی ہوگا جو میری چاہت ہے۔

جواد احمد کی آواز میں یہ الفاظ حیاء کو اندر تک دہلا رہے تھے۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی کہ یہ تو غالباً اسی کی زندگی کا پرتو ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حیاء نے نیا نیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ وہ سادہ سی باحیا لڑکی بہت ایکٹو تھی۔ پہلا سمسٹر بہت اچھا گزرا اس کی بہت سی اچھی فرینڈز بن گئیں۔ یونیورسٹی کے ماڈرن اور بولڈ ماحول میں وہ اکثر خود کو مس فٹ سا محسوس کرتی۔ اکثر اس کا دل چاہتا وہ بھی باقی لڑکیوں کی طرح خوبصورت اور ماڈرن نظر آئے۔ لیکن کوئی انجانی قوت اُسے ایسا کرنے سے ہمیشہ روکتی تھی۔ پھر ایک دن اس کا سامنا اسد سے ہوا۔ اسد بہت خوبرو، سمارٹ، کم گو اور Attitude والا بندہ تھا اور اسکی dressing کمال تھی۔ وہ senior تھا اور صرف ایک ہی پیریڈ حیا کے ساتھ لیا کرتا تھا۔ حیا کی تمام دوستیں اسد سے بہت متاثر تھیں۔ شروع میں وہ حیاء کو کچھ خاص نہ لگا تھا۔ پھر اتفاقاً گروپ پروجیکٹ میں وہ حیاء کے گروپ کا ممبر بن گیا۔ اسد پڑھائی کے بارے میں بہت لاپرواہ تھا اس لئے اکثر حیاء کے بھروسے پر بیٹھا رہتا۔ جس سے کبھی کبھی حیاء کو حیرت بھی ہوتی کہ کوئی اتنا لاپرواہ بھی ہوسکتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ اکثر حیاء کی دوست اُس کو اسد کے نام سے چھیڑنے لگیں، کیونکہ اسد کلاس میں صرف حیاء سے ہی تھوڑی بہت بات چیت کر لیتا۔ لیکن حیاء نے کبھی اس سب کو serious نہیں لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اتنا ماڈرن لڑکا اس جیسی سادہ اور پردہ دار لڑکی کو کیوں گھاس ڈالے گا لیکن اندر ہی اندر کی تبدیلی کو حیاء بھی نہ سمجھ پائی تھی۔ چھٹیوں کے بعد دوبارہ یونیورسٹی کھلی اور جب اسد اور اُس کا آمنا سامنا ہوا تو اس نے مُسکراہٹ کے پھول اس کی جانب بکھیرے تو اُسے عجیب سی چاشنی کا احساس ہوا۔ پر وہ اُس سے بات کئے بغیر ہی وہاں سے چلی گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کرے۔ وہ

اس دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی۔ ایک دوبار پھر ایسا ہی ہوا مگر حیاء نے اُس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ اسد نے حیاء کی حیا اور جھجک کو اس کا ATTITUDE ہی سمجھا۔ اسد جیسا RESERVE بندہ اتنی ہمت نہ کر سکتا تھا کہ خود جا کر دریافت کرے کہ حیاء کیوں اس سے کترا رہی ہے۔ اور حیاء جیسی خوددار لڑکی خود جا کر کبھی اس سے بات نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے دونوں میں دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔ اَنا کی دیوار کھڑی ہوگئی اور اتنی بڑی ہوگئی کہ دونوں میں سرد جنگ شروع ہوگئی جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔

چھ مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے حیاء کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے خود سمجھ نہیں آیا کہ اچانک اسے کیا ہوگیا ہے۔ اس نے ایک بات اپنے دل میں بٹھالی تھی کہ کچھ بھی ہو اسد کبھی بھی اسے پسند نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے خیال میں اسد کا Criteria یقیناً کوئی بہت حسین' ماڈرن لڑکی ہی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیاء نے اپنے دل کا علاج کرنے کے لئے اپنی زندگی کا رخ موڑ لیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ اسے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن نجانے کیوں اسے یقین تھا کہ اسے اسد کو بھولنا ہوگا۔ وہ کبھی اس کا مقدر نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر وقت روتی رہتی، اداس رہتی اور کبھی کبھی رب کی ناشکری بھی کر جاتی اور شکوہ بھی کہ یا تو اسد کو اس کے دل سے نکال دے یا پھر۔۔۔۔۔۔۔؟ اس نے کبھی یقین کے ساتھ اسد کا ساتھ نہ مانگا تھا لیکن ایک بات ضرور تھی کہ اس نے اپنا فیصلہ رب کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک سال گزر چکا تھا اسد نے ایک لڑکی سے دوستی کر لی تھی۔ دونوں یونیورسٹی میں کبھی کبھی نظر آتے تو حیاء حسرت سے انہیں دیکھ کر اسد کو صرف خوش رہنے کی دعا ہی دیتی۔ وہ اسد کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے دل پر پوری طرح حاوی تھا۔ بظاہر تو حیاء اسے اپنے دل سے نکال چکی تھی لیکن۔۔۔۔۔ خیر اس نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی بدل دیا تھا۔ وہ بہت سے Social works میں Involve ہو چکی تھی اور اب تو خیر اسلام کی تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی کو بامقصد اور پرسکون بنا لیا تھا۔ اسے اسد سے اور بھی پیار ہوگیا تھا۔ کیونکہ اسد ہی کی وجہ سے تو وہ اللہ کے اتنے قریب ہوئی تھی کہ ایک سال کی اذیت کے بعد اسے کچھ کچھ سکون آنا شروع ہوا تھا۔

پھر ایک دن اچانک شہر میں دہشت گردی کی بڑی واردات ہوئی شہر بھر میں کرفیو لگ گیا۔ یونیورسٹی میں خبر پھیلی تو سب نے بھاگنا شروع کر دیا۔ حیاء بھی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی کہ اچانک بھاگتے بھاگتے حیاء کو جھٹکا لگا اور وہ گر گئی، گرنے سے پہلے ہی اچانک اسے کسی نے تھام لیا۔ وہ اسد ہی تھا اور اس نے جلدی سے حیاء کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ گاڑی کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ پٹرول ختم ہوگیا۔ اسد نے گاڑی سے قدم باہر نکالا اور حیاء کو لے کر پھر سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر طرف ہنگامی صورتحال تھی۔ ایک گاڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے دو لوگوں کو بھاگتے دیکھا تو فوراً انہیں گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ لوگ شہر سے باہر جا رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں داخل ہونا فی الحال ممکن نہیں۔ حیاء کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ اسے اب حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر گھر والوں کا خیال آ رہا تھا اور یہ بھی کہ اسد اس کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گیا۔ خیر چار گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ لوگ ایک

پہاڑی علاقے میں موجود تھے۔ سارے راستے آنٹی منزہ اسے تسلی دیتی رہی تھیں۔ اسد نے بھی اسے تسلی دینے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن اسے بھی پتہ تھا کہ حیاء گھر والوں کی وجہ سے فکر مند ہے۔ وہاں پہنچتے ہی بڑی مشکل سے اسد نے حیاء کے گھر والوں سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ رفیق صاحب جن کے ہاں وہ لوگ موجود تھے انہوں نے بھی حیاء کے والدین کو تسلی دی تھی کہ ان کی بچی محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ (آنٹی منزہ) مسز رفیق نے تو حیاء کی امی سے خود بات کر کے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ تین دن گزر گئے تھے اور واپسی کے کوئی آثار نہ تھے۔ حیاء کا مارے فکر کے برا حال تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ تین دن سے گھر سے باہر تھی۔ گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ وہ واپس بھی جا سکے گی یا نہیں، کوئی اسے قبول کرے گا یا نہیں۔ اسد بھی حیاء کی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھا اور وقتاً فوقتاً اس کا دل بہلانے کے لئے اُسے مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔ دونوں کی آنٹی، انکل اور ان کی بیٹی سے کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ وہ لوگ بہت ملنسار، مہمان نواز اور مددگار تھے۔ آنٹی، انکل ان کا دل بہلانے کے لئے انہیں اپنے علاقے کی سیر پر بھی لے گئے۔ لیکن حیاء کا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ دو بار اس کی امی سے فون پر بات بھی ہوئی تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اندر کہیں بہت گہرائی میں کوئی نہ کوئی گڑ بڑ تھی۔ شک، وسوسے اور مستقبل کے اندیشوں نے حیاء کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اسد بھی اب اس سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پہلی بار جب اس نے حیاء کو عام گھریلو حلیئے میں منزہ آنٹی کے ساتھ آتے دیکھا تو حیران ہی رہ گیا۔ وہ تو اس کے تصور سے بڑھ کر حسین تھی۔ معصومیت اور سادگی کا عجیب ہی امتزاج تھا جو کسی کے دل کو بھی ہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ پھر پانچویں دن جب حیاء کی بے چینی حد سے بڑھ گئی جس کی وجہ اسد اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مستقبل میں آنے والے طوفان سے خوفزدہ ہے تو اس نے اچانک ہی ایک ایسی بات کی جو دھماکے سے کم نہ تھی۔ حیاء ایک بات پوچھوں؛ مجھے اس کا صحیح جواب چاہیئے۔ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ تمہاری سو فیصد مرضی میں میری مرضی اور دل سو فیصد شامل ہے۔ حیا مجھے تمہاری حیا، پاکیزگی، معصومیت اور سادگی بہت پسند ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک ایسے ہی جیون ساتھی کا ساتھ چاہا ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان ایک عجیب سی دیوار حائل ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے دل کے بہت قریب پایا ہے۔ یہ مناسب موقع تو نہیں یہ بات کہنے کا، لیکن حالات کے پیش نظر میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ حیاء کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو آنٹی منزہ کو بتا دینا۔۔ ہم ابھی نکاح کر لیں گے اور اگر تمہاری مرضی شامل نہیں ہے تو بھی سچے دل سے فیصلہ کرنا۔ اس کے بعد اسد رکا نہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا حیاء کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور حیاء سوچتی ہی رہ گئی کہ اے اللہ تو ایسے بھی اپنے بندے کی مرادیں پوری کیا کرتا ہے؟ تو بے شک اپنے بندے سے ایک ماں سے بھی ستر گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ تیرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہ ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں جو تیرے ناشکرے ہیں؛ ایمان کے کچے ہیں، اے اللہ مجھے معاف کرنا اور یقین کامل عطا کرنا، میرے ایمان کو مضبوط کر میرے مالک اور مجھے ہمت اور توفیق عطا کر کہ میں تیری شکر گزاری اور اطاعت میں اپنی زندگی گزاروں (آمین)۔

اور آج وہی حیاء اسد کے ساتھ ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ اس نے اسد کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے دونوں کامیابی سے ایک

رفاہی ادارہ چلا رہے ہیں، اسلام اور قرآن کی Reserach میں مشغول ہیں دین اور دنیا دونوں میں توازن قائم کرر کھا ہے۔ حقوق اللہ کے ساتھ' حقوق العباد بھی خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں اور یہ سب کچھ صرف اور صرف اس ذات باری تعالیٰ کی طرف ایک نظر کرنے کا انعام ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو مایوسی سے بچائے (یقیناً مایوسی کفر ہے)۔ ہمیں یقین کامل عطا کر کے سیدھا راستہ دکھائے اور ہمیں بھٹکنے سے بچالے (آمین) اور اس کا آسان راستہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کو اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں شامل کر لیں ہر آسان ' مشکل کام اس کے بھروسے پر چھوڑ دیں ہر کامیابی' ناکامی میں اس کی طرف رجوع کریں اور اپنی زندگی اسے سونپ دیں اور اپنے لئے کامیابی کا راستہ چن لیں کیونکہ

نہ تیرا خدا کوئی اور ہے' نہ میرا خدا کوئی اور ہے
یہ جو راستے ہیں جدا جدا' یہ معاملہ کوئی اور ہے

مریم صدیقی (بی بی اے۔۴)



اپنے ہی دام میں

ساجدالرحمن (بی ای ٹی۔۳)

کھڑاک سے گاڑی کا گیٹ بند کرنے کے بعد شکیل نے ڈرائیور سے گھر چلنے کو کہا۔ آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ اسے بڑی رقم کا کام ملا تھا ۔گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔۔۔اٹھارہ برس قبل وہ اور اس کی بیوی ایک بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ایم ایس سی کی ڈگری کے باوجود وہ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا، مگر لا حاصل۔سخت جاڑے کے موسم میں بھی وہ اپنے بچے کو سویٹر لاکر نہ دے سکا تھا۔جس کی وجہ سے اس کو سخت نمونیہ ہوگیا تھا۔کنگال تو وہ پہلے ہی تھا، اب ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔۔۔

اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ بچے کے علاج کے لئے ہسپتال سے ڈاکٹر کی پرچی بنوا سکے، پھر باقاعدہ علاج تو دور کی بات۔۔۔اس نے کتنے لوگوں سے ادھار مانگا، مگر بے سود۔۔۔کوئی راستہ نہ پاکر اس نے بیوی کے زیور بیچ دیئے، ساری رقم علاج پر خرچ ہوگئی مگر بیماری ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔بالآخر ہسپتال والوں نے بھی کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔اسے بیٹا ہاتھوں سے جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔اسی فکر میں وہ ساری رات سو نہ سکا، لیکن اگلی صبح ہسپتال کی انتظامیہ نے اسے ایک خوشخبری سنائی کہ ایک معتبر آدمی نے ترس کھا کر اس کے بیٹے کے علاج کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی ہے۔یہ خبر سن کر شکیل کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے اور وہ سوچنے لگا کہ خدا کی زمین پر اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔۔وہ اس شخص سے ملا اور اس کے ہاتھ چومنے لگا۔وہ اس کے لئے ایک فرشتہ تھا۔اس نے کہا کہ "اے اجنبی! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ چکا سکوں گا"۔اجنبی نے کہا کہ "تم مجھے شرمندہ کررہے ہو"۔ساتھ میں اس نے شکیل کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا اور یقین دلایا کہ اس کی بے روزگاری کے خاتمے کے لئے اقدامات کرے گا۔اگلے دن وہ متعلقہ پتے پر پہنچا تو اجنبی نے اسے ایک بریف کیس تھماتے ہوئے کہا کہ اس کو فلاں بس سٹاپ پر عین مجمع کے درمیان رکھ دے۔۔۔دال میں کچھ کالا تھا۔۔۔ضمیر نے بھی ملامت کی مگر۔۔۔بے روزگاری کا بھوت سامنے آن کھڑا ہوا۔۔۔انعام کی رقم دیکھ کر وہ بم رکھنے پر تیار ہوگیا۔۔۔اور آج وہ ایک زندگی بچا کر جانے کتنوں کو موت کی آغوش میں بھیج چکا تھا، کتنے بچے یتیم اور اَن گنت عورتیں بیوہ ہوچکی تھی۔اُس کی پیسوں کی حرص بڑھتی گئی اور اس کے لیے انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہ رہی۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان نہ تھا، کیونکہ اس کی مفلسی اور ناداری میں کسی نے اس کی مدد نہیں کی تھی تو پھر وہ کیوں کسی کا لحاظ کرتا۔۔۔ابھی وہ سوچوں کے سمندر میں ڈوبا تھا کہ ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ گھر پہنچ چکا تھا۔گھر آتے ہی وہ ڈائننگ روم میں صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔آج اس کا بیٹا اٹھارہ سال کا ہوگیا تھا۔وہ اسے پڑھنے کے لئے باہر بھیج رہا تھا تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اپنا مستقبل بہتر بنا سکے۔اس نے یہ سب کچھ اس کے بہتر مستقبل کے لئے ہی تو کیا تھا، تاکہ اسے وہ مصیبتیں نہ اٹھانی

پڑیں جو خود اس کو اٹھانی پڑیں۔جس شاپنگ مال میں بم رکھ کر آ رہا تھا وہ شہر کا سب سے بڑا شاپنگ مال تھا ٹائم بم پھٹنے میں چند لمحے ہی رہ گئے تھے۔اپنے کام کی کارروائی ملاحظہ کرنے کے لئے اس نے ٹی وی کا سوئچ آن کر کے نیوز چینل لگا دیا۔۔۔چند ہی لمحوں بعد اس کے کارنامے کی جھلکیاں ٹی وی پر آ رہی تھیں۔۔۔ ہر طرف گوشت کے چیھتڑے اڑ رہے تھے۔۔۔خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ شاپنگ مال میں کسی کے زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔۔۔شکیل شیطانی قہقہے لگانے لگا۔اتنے میں اسے باس کا فون آ گیا وہ اسے مبارکباد دے رہا تھا، کام کے بعد کی قیمت کو چکتا کرنے کیلئے باس نے اسے کل آنے کو کہا۔۔۔ایک بڑی رقم۔۔۔۔بیس لاکھ۔۔۔اسے ملنے والے تھے۔۔۔اسے بہت خوشی ہوئی کہ انہی پیسوں سے اس نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجنا تھا۔۔۔

شکیل نے ملازم سے چائے لانے کو کہا اور بیوی اور بچے کے بارے میں دریافت کیا۔۔۔ملازم نے بتایا کہ اس کی بیوی اور بیٹا شاپنگ کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں اور اسے اکیلے ہی کھانا کھا لینے کا کہہ کر گئے ہیں کیونکہ انہیں دیر ہو جانا تھی۔۔۔جب شکیل نے ملازم سے شاپنگ مال کے بارے میں دریافت کیا تو۔۔۔اس کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔۔۔سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔۔۔

ہوس دھن سے وہ سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔

سامعہ اکبر (بی بی اے۔۸)



چک کو مسیلٹس

محبت پھر بھی ادھوری ہے

حسن ناصر (بی سی ای۔۲)

آج ٦ مارچ کی شام تھی اور وہ پھر سے مامی کا مہمان تھا۔ جب بھی وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا، اُسے کچھ یاد نہ آتا ماسوائے اُس گزرے ہوئے پیار کے جو اُس نے کیا تھا۔ بشریٰ کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اس کے ذہن پر نقش تھا۔

جبران کی خالہ کی شادی تھی۔ اُن کے خاندان میں پہلی بار کوئی لڑکی خاندان سے باہر بیاہی جا رہی تھی۔ وہ بھی اس شادی میں شریک تھا کیونکہ اُس کو خاندان میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔

''جبران۔۔۔۔۔ مجھے ثوبیہ کا نمبر ملا دو، میں ذرا اس کا حال پوچھ لوں۔'' یہ جبران کی ماں کی آواز تھی جو اُسے خالہ سے بات کرانے کو کہہ رہی تھیں۔

''اچھا امّاں جان'' جبران نے اپنی ماں کی بات کا جواب دیا۔

''ہیلو اسلام علیکم۔۔۔ میں جبران بات کر رہا ہوں' ذرا میری خالہ سے بات کروا دیں''۔ جبران نے خالہ کے سسرال فون کر کے کہا۔

''اوہو۔۔۔۔۔ تو آپ ہیں جبران! بڑی تعریفیں سنی ہیں ہم نے آپ کی' اپنی نئی چچی سے''۔ ایک خوبصورت نسوانی آواز نے جواب دیا۔۔۔

''دیکھیں پلیز خالہ سے بات کرا دیں''۔ جبران نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''اور اگر نہ۔۔۔۔'' ''ہیلو السلام علیکم۔۔۔'' فون اب خالہ کہ ہاتھ میں تھا۔ جبران نے پہلی آواز کے متعلق دریافت کیا تو خالہ نے جبران کا تعارف بشریٰ سے کرایا۔ اُس نے خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد فون ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ فون بند کرنے کے بعد ماں نے جبران کو بتایا کہ اگلے اتوار وہ خالہ کے گھر دعوت پہ جا رہے ہیں۔

اتوار کو جبران اپنے والدین کے ساتھ اُن کے گھر دعوت پر گیا۔ پہلی بار یہاں اُن دونوں کی ملاقات ہوئی' ہنستی کھیلتی' شوخ وچنچل بشریٰ کو تو جیسے جبران کو دیکھنے کے بعد چُپ سی لگ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جبران اتنا خوبصورت ہوگا۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس کو دل دے بیٹھی تھی لیکن جبران کی خاموشی اور رعب نے اسے دل کی آواز باہر لانے سے روک دیا۔ بشریٰ تو اس کی دیوانی ہو چکی تھی اور اس نے جبران کا نمبر اس کے چھوٹے بھائی سے لیا اور تین دن بعد جب جبران اپنے امتحانوں کی تیاری کر رہا تھا تو پاس ہی پڑا اس کا موبائل بجا۔ کسی اجنبی نمبر سے کال تھی۔ جبران نے فون اٹینڈ کیا ''ہیلو اسلام علیکم۔۔۔۔ کون؟'' نسوانی آواز سن کے جبران تھوڑا تجسس میں پڑ گیا

''جی فرمایئے''

''کیا فرماؤں جناب؟ آپ حکم کریں''۔اب جبران کہ چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔''دیکھیں میڈم آپ دماغ خراب نہ کریں مجھے امتحان کی تیاری کرنے دیں خدا حافظ''۔جبران نے اگلی بات سنے بغیر کال کاٹ دی تھی۔اگلے ہی لمحے دوبارہ کال آئی۔

''کیا مسئلہ ہے؟''اب کی بار جبران ذرا غصے والے لہجے میں بولا تھا''کچھ نہیں۔۔۔۔میں بشریٰ بات کر رہی ہوں۔تمہاری نئی کزن'غصہ کیوں ہوتے ہو؟''اب کی بار بشریٰ نے جبران کو بتا دیا تھا۔دونوں میں کچھ دیر بات چیت ہوئی اور آخر میں بشریٰ نے اسے بتایا کہ یہ نمبر اس کا اور اس کی دوست سحرش کا مشترکہ نمبر ہے۔بشریٰ کی وجہ سے جبران کی دوستی سحرش سے بھی ہوگئی اور پھر دونوں کی دوستی کافی چل نکلی۔

اب جبران کی زیادہ تر بات سحرش سے ہی ہوتی تھی۔بشریٰ سے بھی کبھی کبھی ہو جاتی تھی لیکن زیادہ نہیں۔ایک دن سحرش نے جبران کو ایک حقیقت سے آگاہ کیا کہ بشریٰ اس میں دلچسپی لیتی ہے لیکن اس کے غصے سے ڈرتی ہے۔لہذا جبران کو کچھ کرنا چاہیئے۔

اتنے عرصے میں جبران خود بھی اسے چاہنے لگا تھا۔سحرش کی کی ہوئی باتوں سے جبران کو اور حوصلہ ملا اور اس نے بشریٰ کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا جس کا اقرار بشریٰ نے بھی کیا۔اور پھر یہ گاڑی چل پڑی ایک دوسرے سے ملنا اور اکٹھے شاپنگ پر جانا'جبران کی زندگی میں بہار سی آگئی تھی۔وہ اتنا خوش تھا کہ جب کوئی قابل اعتماد دوست نہ ملا تو ڈائری اور قلم سے دوستی کر ڈالی۔کہتے ہیں کہ''عشق،مشق چھپائے نہیں چھپتے''۔جبران کی ڈائری اس کے والد کے ہاتھ لگ گئی لیکن انہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ جو لڑکی انہوں نے پسند کی تھی جبران کی بھی وہی پسند تھی۔اب تو بس بات کرنے کی دیر تھی۔لیکن پھر حالات بدلنے لگے۔بشریٰ کا رویہ بدلنے لگا تھا۔کچھ حاسدوں کو یہ جوڑ پسند نہیں آرہا تھا۔جبران ان دنوں بہت پریشان تھا۔خاندان کی عزت کی وجہ سے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔وہ سحرش کو اپنا دوست سمجھ کر اس سے باتیں شیئر کرتا تھا اور وہی دوست اس کی بدخوئیاں بشریٰ کے سامنے کرتی۔ایک دن ایسے ہی جبکہ وہ اس سے گِلہ کر رہا تھا تو اس نے وہ سب باتیں بشریٰ کو سنوا دیں۔اب تو بشریٰ نے بھی سحرش کو سچ جانا اور پھر ایک لمحے کا توقف کیے بغیر رشتہ توڑ دیا۔

جبران کی آنکھوں میں آنسو تھے۔آج وہ بہت رویا۔اس نے رب سے بہت گلہ کیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔آج جبران پھر وہی منظر یاد کر کے رات کے پچھلے پہر پشیمان بیٹھا تھا۔وہ بشریٰ کے اُس میسج کو بار بار پڑھ رہا تھا۔

''اچھا میں نے آپ کو یہ بتانا ہے کہ ۶ مارچ کو میں آپ کے گھر آئی جب آپ نے نوٹس دیئے اور ہمیں پیار ہوا۔اِس مہینے کی ۶ کو ہمارے پیار کو پورے دو سال مکمل ہو گئے۔''

۱۱نمبر بس

ثاقب صغیر جنجوعہ (بی ای ایل۔۴)

''آج استاد سے تنخواہ ملے گی تو اپنی صغریٰ کے لئے ایک اچھا سا سوٹ خرید کر لاؤں گا۔۔۔۔۔ کتنی خوش ہوتی ہے نا جب اس کے لئے کوئی تحفہ لے کر آتا ہوں'' خالد یہ سوچ ہی رہا تھا کہ صغریٰ کی آواز آئی''۔

''ناشتا تیار ہے بھائی۔۔۔جلدی سے آ کر ناشتہ کر لو۔۔۔۔۔۔''

''اتنا کام کرتا ہے تُو کبھی چھٹی بھی کر لیا کر''

خالد: ''ارے پگلی اگر چھٹی کروں گا تو تنخواہ کے پیسے کٹ جائیں گے۔ پھر گزارہ کیسے ہوگا۔''

صغریٰ: ''ہاں یہ بات تو ہے۔۔۔۔۔ پھر بھی میں تو یہ کہتی ہوں کہ آج کام پر مت جا''

خالد: '' نہیں آج ضرور جانا ہے' تنخواہ جو ملنی ہے''

صغریٰ جھٹ سے بولی'' اچھا!۔۔۔تو۔۔۔۔۔ پھر میرے لئے کیا لے کر آئے گا۔''

خالد: ''یہ تو میں آ کر ہی بتاؤں گا۔ اچھا ابھی میں چلتا ہوں' ۱۱ نمبر بس بھی پکڑنی ہے۔ خدا حافظ''

''سَنی بیٹے دودھ تو پیتے جاؤ''

''آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا ٹھیک طریقے سے۔۔۔۔۔'' سَنی کی ماں شکوے کے سے انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

سَنی: ''امی مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے''

امی: '' بیٹا سیدھے اسکول جانا اور سیدھے گھر لوٹنا''۔

سَنی: ''امی مجھے پتا ہے۔۔۔۔۔ اب تو مجھے بھی یہ بات یاد ہو گئی ہے۔۔۔۔ میری پیاری امی آپ فکر کیوں کرتی ہیں' اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اچھا امی مجھے دیر ہو رہی ہے' بس سٹاپ پر وقت پر پہنچوں گا تو ہی ۱۱ نمبر بس ملے گی۔ اللہ حافظ'' یہ کہتے ہی سنی روانہ ہو گیا۔

''میرے لال میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ تیرے باپ کے بعد ایک تو ہی تو میرا واحد سہارا ہے۔ جا اللہ تیرا حامی و ناصر ہو'' ماں نے دعاؤں کی چھاؤں میں بیٹے کو رخصت کیا۔

''امی ٹیچر کہہ رہی تھی کہ پچھلے مہینے کی طرح اس مہینے بھی فیس لیٹ جمع کروائی تو اسکول سے نکال دوں گی'' ننھی عائشہ تقریباً رونے کے سے

انداز میں ماں سے فیس کا مطالبہ کر رہی تھی۔

''عائشہ رانی! تم اسکول جاؤ، فیس جمع کروا دیں گے بچے'' ماں بیٹی کو پچکارتے ہوئے بولی اور عائشہ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اتنی دیر میں اکرم دوسرے کمرے سے نمودار ہوا اور جھگڑتے ہوئے بولا ''امی مجھے کتابیں اور کچھ رجسٹر خریدنے ہیں۔۔۔آپ کو ایک ہفتے سے کہہ رہا ہوں''

''بیٹے آج تمہاری بہن کو تنخواہ مل جائے گی تو تمہیں کتابیں بھی دلا دوں گی''۔

ساتھ ہی ماں نے اپنی بڑی بیٹی بشریٰ کو آواز دی۔''بشریٰ! میری بچی کھانا کھا لے''۔

''امی آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں''۔بشریٰ نے کھانے کی میز پر ماں کو افسردہ اور پریشان دیکھا تو بول اٹھی۔

''بیٹی، بجلی، پانی، گیس اور فون کا بل اس دفعہ بھی بہت زیادہ آیا ہے۔مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔بچوں کے خرچے ہیں۔تیرے معذور باپ کی دواؤں کا خرچہ اور نہ جانے کیا کیا بلا ہمارے سر آتی جا رہی ہے''۔

بشریٰ ماں کو تسلی دیتے ہوئے بولی ''امی آپ فکر نہ کریں۔میں نے اوور ٹائم لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔پھر دیکھنا اللہ کی مہربانی سے سارے خرچے پورے ہو جائیں گے۔''

''پہلے ہی زیادہ کام کر کے تو اتنی کمزور ہو گئی ہے اب اور کتنا کرے گی''۔

بشریٰ: ''اماں جب تک دم میں دم ہے کرتی رہوں گی۔''

امی: ''جیتی رہ میری بچی۔۔۔۔جیتی رہ''

بشریٰ جانے کے لئے اٹھی، ٹائم دیکھا تو بولی ''اوہ۔۔۔۔آج تو دیر ہو گئی۔اب ۷ نمبر ویگن تو ملنے سے رہی۔۱۱ نمبر بس پر ہی جانا پڑے گا۔

''آج پنشن کی رقم لینے کے لئے نہیں جا رہے محبوب عالم؟؟''

محبوب: ''نسیم بیگم! سوچ رہا ہوں کہ کیا بیٹوں کو اس لئے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ آج وہ بیویوں کے ہو کر رہ جائیں اور ہم یہاں اولڈ ہاؤس میں پڑے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرتے رہیں''۔

نسیم بیگم: ''محبوب عالم! خدا کا واسطہ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔۔۔۔کیا ایسی باتیں کرنے سے وہ تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔''خیر اب جاؤ بھی، جی پی او والی بس تمہارا انتظار کر رہی ہے''

محبوب:۔ارے روز بھول جاتی ہو۔کتنی بار بتاؤں کہ اب بنک کو ۱۱ نمبر بس جاتی ہے۔جی پی او والی نہیں۔

اچھا میں چلا''۔

اا نمبر بس اپنے روٹ پر رواں دواں تھی کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور بولنے لگا۔

'' لو بھائی جان میں تہاڈے لئی ایک ایسی چیز لے کرآیاں جد اتعلق تہاڈی صحت نال اے۔ لوبھئی بھراؤ تے بھینوں، کیندے نیں '' تندرستی ہزار نعمت اے''۔ تے اے گل سو فیصد سچی وی اے' تندرستی دا کوئی مُل نہیں۔ جناب' تندرستی دی قدر بیماراں کولوں پُچھو''۔

لو میرا بھائی جیڑا میرا کوئی بھرا کیندا اے میرا پیٹ خراب اے' یا گھٹے گھٹے ڈکار آندے نیں' کھانا ہضم نہیں ہوندا' قبض دی شکایت اے ۔۔۔۔۔ تے ۔۔۔۔ میرا بھائی اوناں لئی حکیم ولید الدین ولید دی تیار کیتی اے سپیشل پھکی ' جیڑی اپناں تمام بیماریاں نوں جڑ توں ختم کر دیوے گی۔ دواخانے دا پتہ وی لکھیا ہویا اے ایدے اُوتے۔ باہروں لوگے تے اے ڈبی ملے گی تہانوں ۲۰ روپے دی۔ پر ایس ٹیم دواخانے دی مشہوری لئی خود چل کے تہاڈے کول آیاں تے ایس ڈبی دی قیمت وصول کر ریاں دس روپے' دس روپے' دس روپے۔۔۔۔۔۔۔ تے اے دس روپے۔ دل منّے تے لو نہیں تے کوئی زبردستی نہیں''۔

'' ریلوے سٹیشن آلے بھائی۔۔۔'' اا نمبر بس کے کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

بس کے رُکنے کی دیر تھی کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور بس کے پرخچے اڑ گئے۔ ہر طرف خون ہی خون' چیتھڑے ہی چیتھڑے۔۔۔۔ گوشت کے لوتھڑے۔۔۔۔۔۔ آہ و بکا۔۔۔۔۔ چیخ و پکار۔۔۔۔۔۔۔۔

کس نے صغریٰ کا سہاگ اس سے چھین لیا۔۔۔۔ بشریٰ کا خاندان کیسے گزر بسر کریگا۔ ایک بیٹا جو ماں کا آخری سہارا تھا، اُس سے جدا ہو گیا۔ افضل صاحب، حکیم ولید الدین۔۔۔۔۔ پنشن' محبوب عالم۔۔۔۔ عائشہ۔۔۔ سکول۔۔۔ سَنی۔۔۔۔۔۔۔۔ خالد' تنخواہ' للو ۔۔۔۔ سب۔۔۔۔ ایک لمحے میں۔۔۔۔۔

ایک لمحہ۔۔۔۔ اور جانے کتنی گودیں ویران ہو گئیں۔۔۔ کتنے سہاگ اجڑ گئے۔۔۔۔ کتنی بہنیں بھائیوں سے محروم اور کتنے بھائی بہنوں سے۔۔۔۔ کیا کسی کی دشمنی اور غصہ کمزوروں پر نکالا جاتا ہے۔۔۔۔۔

حکومت غلط ہے تو عوام کو مارنا شروع کر دو۔۔۔۔۔ اسلامی نظام نہیں قائم ہو رہا تو دھماکے کر دو۔۔۔۔ اسلام۔۔۔۔ جہاد۔۔۔۔۔

نہیں چاہیئے یہ جہاد۔۔۔ نہیں چاہیئے ایسا اسلام۔۔۔۔۔ جو بے قصوروں' نہتوں کو مارنے کو حکم دے۔۔۔۔ نہیں چاہیئے ایسے رب کی خوشنودی جس کے لئے نام نہاد مولوی قتل عام جائز کر دے۔۔۔۔۔

جانے کِس دیس روٹھ کے گئی خوشیاں میری
وہ جو اِک شخص میری زندگی کو اِتنا بدل گیا
عصمہ ناز (بی ایس بی۔۲)

چڑیلوں کے مقابلے کی آنکھوں دیکھی روداد

مریم ظہیر چوہان (بی ای ایل۔۳)

یونیورسٹی کے تھکن زدہ ماحول کے بعد گھر آ کر میں دوپہر کو سونے کے لئے پلنگ پر لیٹی اور فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے کندھے پر کسی نے تھپکی دی۔ میں نے ہڑبڑا کر سر اوپر اٹھایا اور پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک نہایت خوفناک عورت کھڑی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے اور میں لگی ناک کی سیدھ میں بھاگنے۔ مگر یہ کیا؟ سامنے اس سے بھی زیادہ بدصورت چڑیل کھڑی تھی۔ ان محترمہ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دونوں نے مجھے بری طرح گھیر لیا، اب میں جاؤں تو جاؤں کہاں؟ میں نے سوچا جب دشمن زبردست ہو تو زور آزمائی کام نہیں دیتی۔ حکمتِ عملی سے یا دوسرے لفظوں میں چال بازی سے کام بنتا ہے۔ ہم نے سوچا چلو انہیں بیوقوف بنا کر کام نکالیں۔ اتنے میں ہماری نظر ان دونوں کی کمر پر پڑی تو ایک کے پیچھے کیمسٹری اور دوسری چڑیل کے پیچھے فزکس کا لیبل لگا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ ان حملوں کا مقصد کیا ہے۔ اب میں نے دیکھا کہ پہلی نے دوسری پر حقارت بھری نظر ڈالی۔ اس پر دوسری چڑیل بھڑک اٹھی اور بولی" بی کیمسٹری! دیکھو اپنی حد سے آگے نہ بڑھو۔ اپنی اوقات میں رہو" کیمسٹری بولی" مجھے میری اوقات یاد دلانے چلی ہے اللہ تیری Density اور Specific gravity کا بیڑا غرق کرے۔ ابھی ایک Valency ماروں گی اور منہ توڑ کے رکھ دوں گی"۔

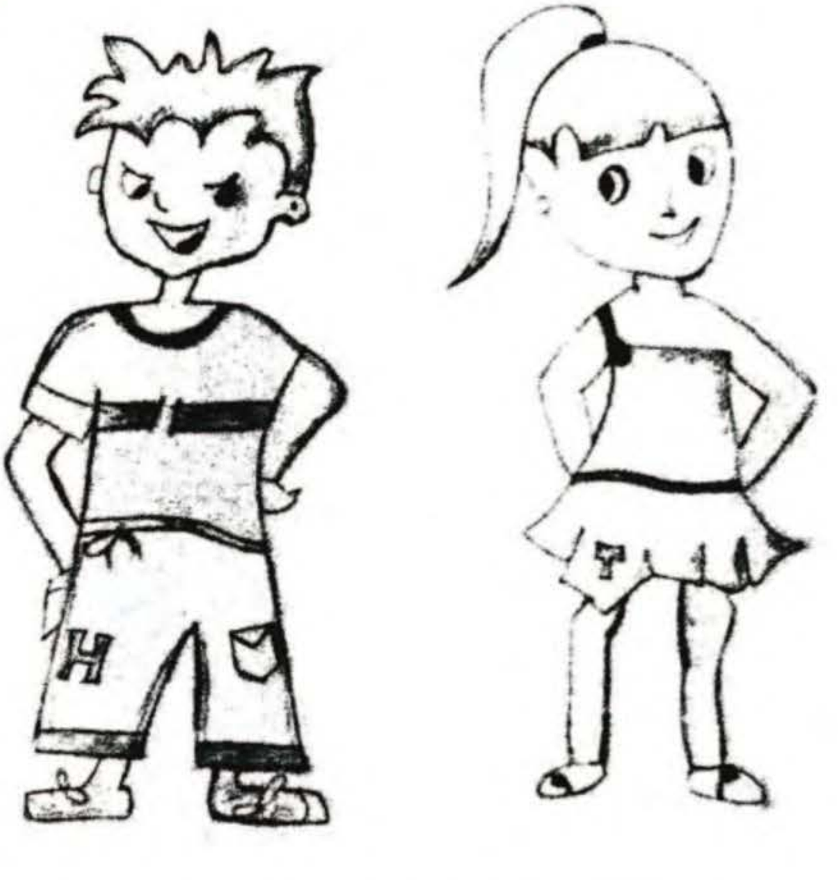
فزکس بولی" بڑی آئی مارنے والی ابھی تیرا Physical balance درہم برہم کرتی ہوں۔ تیری Valency کا ستیاناس نہ کروں تو نام نہیں۔ ایک Vector مارا تو Laws of Newton یاد آ جائیں گے"۔ میں یہ تماشا دیکھ ہی رہی تھی کہ دروازے سے ایک اور چڑیل بڑی سی تلوار ہاتھ میں تھامے نمودار ہوئی، اس نے تو میرے پاس آ کر تلوار میری گردن پر رکھ دی اور بولی چلو نکالو بائیولوجی کی کتاب۔ ورنہ معلوم ہے نا میں آدمی کو ڈھانچہ بنا کر چھوڑتی ہوں۔ پہلی دو چڑیلیں جو آپس میں لڑ رہی تھیں بعد میں آنے والی کی طرف متوجہ ہو گئیں اور وہ دور ہی سے للکاری، اگر میری طرف آنے کی جرات کی تو Cortex مار کر تمہارا Oesophagus تو کیا Verterea اور Duodenum کا بھی بھرکس نکال دوں گی، میں سارا تماشا دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔

یہ دستورِ زبان بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ابھی یہ شعر میرے ذہن میں ہی تھا کہ ایک خوفناک آواز گونجی، ہاہاہا سامنے دیکھا بندوق پکڑے ایک اور بھاری بھرکم جن کھڑا تھا جس نے

آتے ہی اپنی بھدی آواز میں Integration کا وظیفہ پڑھا۔اب میں سمجھی کہ یہ وہ صاحب ہیں جن کا نام سن کے اکثر طالب علموں کو بخار ہو جاتا ہے۔ان حضرت نے آتے ہی بندوق زمین پر ماری اور چنگھاڑ کر ایک نہایت لمبا شیطان کی آنت قسم کا Differential Equation کا سوال بھی دے دیا اور کہا کہ اسے پانچ منٹ میں حل کرو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ابھی میں ڈرتی کانپتی اس سوال پر طبع آزمائی کرنے والی تھی کہ کھڑکی سے دو بوڑھی خواتین میرے چھوٹے سے کمرے میں کود پڑیں۔میری بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔یہ بڑھاپا دیکھو اور اتھلیٹ بننے کا شوق۔خیر ہم نے ہنسی ضبط کی اور نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کیا' محترم خواتین' آپ مجھ عاجز اور مجبور لڑکی سے کیا چاہتی ہیں؟ آپ بھی مشقِ ستم فرمائیں میں حاضر ہوں' ان کے بتانے پر پتہ چلا کہ یہ اسلامیات اور میڈم انگلش ہیں' بس ان کی کسر رہ گئی تھی۔میں نے ان حملوں سے گھبرا کر ایک نعرہ لگایا۔یا اللہ مدد! اور پھر اپنی ہی نعرہ بازی کے شور میں میری آنکھ کھل گئی۔میرا بھائی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔اور میں کھسیانی سی ہنسی ہنس دی.....!!

خدیجہ طارق (بی ایس بی۔۴)



احسان فراموش

تاثیر عباس (بی سی ای۔۵)

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

رحمان صاحب نے کلاس میں سبق کے دوران یہ شعر پڑھا تو کلاس میں سے ان کا ایک شاگرد قلم کاغذ پکڑے اٹھ کھڑا ہوا۔

''سر پلیز! ذرا دوبارہ پڑھیں اس شعر کو۔

خالد کی تائید میں باقی کلاس سے بھی آوازیں آئیں۔

رحمان صاحب پہلے تو انکار کرتے رہے۔ مگر شاگردوں کے اصرار نے انہیں شعر دوبارہ پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے شاگردوں کے شوقِ شعروشاعری نے انہیں ایک اور شعر پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر طلبہ نے ایک اور شعر کی فرمائش کر دی۔ یوں کبھی وہ اپنی مرضی سے اور کبھی طلبہ کی مرضی سے اشعار پڑھتے گئے اور پیریڈ کا دورانیہ ختم ہو گیا۔ اس دوران انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے جتنے بھی اشعار پڑھے ہیں وہ سب خالد صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا رہا۔ انہیں محسوس ہوا کہ اس لڑکے میں شاعری کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اگلے روز وہ کلاس میں داخل ہوئے تو بلیک بورڈ پر درج تھا

''سر پہلے ایک پیاری سی غزل اور پھر پڑھائی''۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے ڈسٹر سے اسے مٹا دیا اور کتاب کھول کر پڑھانے لگے۔ مگر کلاس میں بیٹھے تمام لڑکے ان کی جانب دیکھتے رہے اور کتابیں نہ کھولیں۔ انہوں نے غصے میں سب کو کتاب کھولنے کو کہا تو سب نے کتابیں کھول لیں۔ انہوں نے منہ دوبارہ کتاب کی طرف کیا ہی تھا کہ خالد اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے ہی مودب انداز میں کہا۔

''سر! اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں''

''ہاں بولو'' رحمان صاحب نے کہا

''سر، ہم نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا مگر آپ نے اسے نظرانداز کر دیا۔ چلیں ایک غزل پوری نہ سہی کوئی شعر ہی سنا دیں۔''

رحمان صاحب اس کی بات کو ٹال نہ سکے اور انہوں نے طلبہ کی پہلی خواہش کے مطابق ان کو پروین شاکر کی غزل سنائی۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

تمام طلبہ بڑے انہماک سے غزل سننے میں مصروف تھے مگر خالد سننے کے ساتھ ساتھ غزل کے اشعار کو لکھتا بھی جا رہا تھا۔

غزل کے بعد جب انہوں نے پڑھانا شروع کیا تو انہیں خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام طلبہ پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی بات سن رہے تھے۔

پیریڈ جونہی اختتام پذیر ہوا تو جاتے ہوئے انہوں نے خالد کو اپنے پاس بلایا۔

''خالد بیٹا' میں جو اشعار تمہیں سناتا ہوں وہ تم کیوں لکھتے ہو۔ حالانکہ باقی تمہارے تمام ساتھی صرف سننے پر اکتفا کرتے ہیں''۔

''سر دراصل مجھے شاعری پڑھنے' لکھنے اور سننے کا بہت شوق ہے' مجھے جہاں کہیں سے اچھا شعر ملے میں اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیتا ہوں''۔

''کیا کبھی خود بھی شاعری کی ہے''۔

''بس کبھی کبھی جو من میں آتا ہے وہ لکھ لیتا ہوں' پھر خود ہی لطف اندوز ہو کر پھاڑ ڈالتا ہوں۔''

''اوہو' یہ تو تم بہت برا کرتے ہو' چلو اب جب بھی کبھی لکھنا تو مجھے ضرور دکھانا۔''

''جی سر'' خالد نے جواب دیا۔

جونہی آج پیریڈ اوور ہوا تو خالد رحمان صاحب کے پیچھے چپکے سے چل دیا۔ کچھ دور جا کر رحمان صاحب کو قدموں کی چاپ سنائی دی تو انہوں ے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ! خالد تم' کیا بات ہے' بڑی خاموشی سے تعاقب کر رہے تھے''۔

(گھبراتے ہوئے)

''نن' نہیں سر' کچھ بھی تو نہیں میں بس ویسے ہی آپ کے پیچھے چل پڑا' اچھا سر میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے''۔

خالد نے ہاتھ میں دبایا ہوا کاغذ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''خالد یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ لاؤ دکھاؤ مجھے''

''نہیں سر' کچھ نہیں ہے کیا کریں گے آپ اسے دیکھ کر، ایسے ہی اسے پکڑا ہوا تھا میں نے''۔ خالد پہلے گھبرایا ہوا تھا اب سٹپٹا بھی گیا۔

مگر رحمان صاحب نے بھی اسے نہ چھوڑا اور کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

زلف تیری صنم، خدا جانے
جو بنائے ہزار ، دیوانے
خوبصورت وہ چاند سا چہرہ
کر چکا کتنے خاک ، مستانے

''واہ بھئی''
رحمان صاحب غزل کے اشعار پڑھ کر عش عش کر اٹھے۔
''خالد! یہ کس کی غزل ہے، بہت عمدہ لکھی ہوئی ہے''
''واقعی سر!! آپ مذاق تو نہیں کر رہے''۔
''نہیں یار، میں کیوں مذاق کرنے لگا' واقعی یہ بہت خوبصورت لکھی ہوئی ہے''
''سر یہ میری الفاظ کے موتیوں کو ایک جگہ پرونے کی کوشش ہے۔ آپ نے توصیفی کلمات کہہ کر میرے دل کو اور ہمت عطا کی ہے''۔
''بھئی تم تو کافی اچھا لکھ لیتے ہو۔ ہماری کلاس میں اتنا اچھا شاعر موجود تھا اور ہمیں اس چیز کا علم بھی نہیں ہو سکا''۔
''سر' اتنی زیادہ عزت افزائی نہ کریں۔ کہیں میں آپے سے ہی باہر نہ ہو جاؤں''۔
''نہیں خالد' میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ بلکہ واقعی تمہارے خیالات کافی اچھے ہیں' بس اور زیادہ محنت کرو' اور مختلف شعراء کا کلام پڑھا کرو' تاکہ تمہارے خیالات میں اور زیادہ پختگی آئے''۔
''دراصل سر' میرے پاس اس وقت باقاعدہ کسی شاعر کا کلام موجود نہیں ہے۔ بلکہ میں نے ایک ڈائری بنا رکھی ہے' وہی میرے لئے دیوان بھی ہے اور وہی سب کچھ ہے''۔
''اچھا تو تم اس طرح کرنا کہ کل میرے گھر آ جانا' میں تمہیں ایک کتاب دوں گا۔ جسے تم احتیاط سے پڑھنا اور جو چیز اچھی لگے اسے لکھ بھی لینا اور ساتھ میں یاد بھی کرنا' چلو میرے گھر آنے کی تکلیف نہ کرنا' بلکہ میں کل خود تمہارے لئے کلاس میں کتاب لیتا آؤں گا۔
''بہت بہتر سر' جیسے آپ بہتر سمجھیں''۔
اگلے دن رحمان صاحب نے خالد کو فیض کی کتاب ''نقشِ فریادی'' دی۔
خالد تو اس کتاب کو تھامے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ایک تو وہ کافی عرصے سے اس کتاب کی تلاش میں سرگرداں تھا' دوسرا اسے آج محسوس ہوا کہ وہ واقعی کچھ لکھنے کے قابل ہے۔ اسی لئے تو رحمان صاحب نے اسے اپنی لائبریری سے پڑھنے کے لئے کتاب عنایت کی ہے۔ ورنہ انہیں بھلا اس سے کیا مفاد ہے۔
نقشِ فریادی کا ایک ایک لفظ خالد کو ہیرے جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ کلام پڑھ کر محسوس ہوا کہ آج تک اس نے جو کچھ لکھا ہے دراصل اس کلام کا ہزاروں حصہ بھی نہیں بنتا۔ اس نے ہر شعر اور مصرعے کو بڑے غور سے پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔
دو ہفتوں تک کتاب اس کے پاس رہی۔ اس دوران میں وہ تقریباً تمام غزلیں اور نظمیں اپنی ڈائری میں اتار چکا تھا۔ کتاب واپس کرنے کو اس کا جی تو نہ چاہ رہا تھا مگر اس نے رحمان صاحب کو کتاب لوٹا دی۔ کتاب واپس لیتے ہوئے رحمان صاحب نے خالد سے دریافت

کیا کہ کیا وہ نثر میں بھی دلچسپی رکھتا ہے یا نہیں۔

تو خالد نے رحمان صاحب کو بتایا۔

''سر' مجھے شاعری سے شغف ہے مگر میں نے ''نقشِ فریادی'' شاعری کی پہلی کتاب پڑھی ہے۔ جبکہ نثر کی میں تقریباً ستر یا اسی کتب پڑھ چکا ہوں جن میں پریم چند کی ''میدانِ عمل''، نسیم حجازی کی '' خاک اور خون'' کے علاوہ دس کتب اور اس کے علاوہ طارق اسماعیل ساگر کی کتب اور علیم الحق حقی کی ''عشق کا عین'' وغیرہ کے علاوہ اور بہت سی کتب پڑھ چکا ہوں۔

''واہ بھئی' اب اتنا کچھ نثر میں پڑھ چکے ہو تو یہ بتاؤ کہ کبھی نثر میں بھی کچھ لکھا ہے یا نہیں''۔

''نہیں سر' ابھی تک لکھنے کی نوبت نہیں آئی''

''تو پھر میں تمہارے ذمہ ایک کام لگا رہا ہوں۔ اگلے ہفتے سکول میں بزمِ ادب ہو رہا ہے تمہیں اس کے لئے کچھ لکھ کر لانا ہوگا''۔

''بہت مشکل' بہت ہی مشکل' بلکہ ناممکن سر'' خالد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیسے ناممکن' اتنا کچھ پڑھ چکے ہو تو اب کچھ نہ کچھ لکھ کر بھی لانا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اگر نہ لکھ لائے تو پھر کبھی میرے سے بات نہ کرنا''۔

''سر آپ نے بہت مشکل کام ذمہ لگایا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور کام کہیں میں اسے پورا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ مگر اپنا حکم واپس لے لیں۔''

''یہ ادنیٰ سا کام تو تمہارے سے ہو نہیں سکتا اور لگے سر دھڑ کی بازی لگانے'' رحمان صاحب نے بڑے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

اچھا تو سر یہ بات ہے' اب آپ دیکھیں کہ میں کیا لکھ لاتا ہوں' آپ نے میری غیرت کو للکارا ہے''

''یہ ہوئی نا بات' تم لکھ لاؤ، باقی کاٹ چھانٹ میں کر دوں گا اور ایک معیاری تحریر حاظرین کو سننے کو مل جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مدد لینی ہو تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا''۔

خالد نے دن رات ایک کر دیئے اور تیسرے دن ایک افسانہ لے کر رحمان صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ رحمان صاحب نے وہ کاغذ لے کر اپنی ڈائری میں رکھ لیا اور باقی تحاریر کی کاٹ چھانٹ میں مصروف ہو گئے۔

اگلے دن خالد نے افسانے کے متعلق رحمان صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا۔

''ابھی وہ میری ڈائری میں پڑا ہے کل اسے دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا' بہت سی تحریریں آئیں ہوئی تھیں۔ آج دیکھوں گا۔''

اگلے دن خالد نے پھر دریافت کیا تو رحمان صاحب نے پیریڈ کے بعد ملنے کو کہا۔ پیریڈ کے اختتام پر انہوں نے بتایا کہ انہیں بزم ادب کے لئے پندرہ تحریریں چاہیئے تھیں جو اس کی تحریر آنے سے پہلے ہی پوری ہو چکی تھیں۔ اس لئے اگلے سال انشاءاللہ تمہیں موقع دیں گے۔

خالد بہت دلبرداشتہ ہوا' اس نے رات دن ایک کر کے وہ افسانہ لکھا تھا مگر پھر بھی وہ بزمِ ادب میں جگہ نہ بنا سکا۔

"چلیں سر' آپ مجھے اس کی کاٹ چھانٹ کر دیں میں اپنی پہلی نثری تحریر کو اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔"

"ہاں' ابھی تو کافی ذمہ داریاں ہیں، بزمِ ادب کے بعد مجھے یاد کرانا"۔

بزم ادب گزر گیا' مگر نہ تو رحمان صاحب کو یاد رہا اور نہ ہی خالد نے انہیں یاد کرایا۔ کچھ دن بعد اس نے تین اور غزلیں انہیں چیک کرنے کے لئے دیں اور پچھلی غزل کے بارے میں استفسار کیا۔

رحمان صاحب نے کہا کہ گھر میں کہیں رکھی تھی، مگر جلد ہی مل جائے گی۔

ٹھیک ہے سر' خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلو' یہ سب اکٹھی تمہیں چیک کر کے لوٹا دوں گا"

یہ تو اور بھی بہتر ہے' خالد نے جواب دیا۔

اسی دن خالد کسی کام کے سلسلے میں اپنے انگلش کے ٹیچر کے گھر گیا۔ اتفاق سے ان غزلوں کی ایک کاپی اس کی انگلش کی کتاب میں موجود تھی جو ورق الٹتے ہوئے نیچے گر گئی۔ احمد صاحب نے کاغذ کو نیچے سے اُٹھایا اور پڑھنے لگے۔

واہ' کیا خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ احمد صاحب نے تعریفی جملہ کیا۔

اور پھر تو احمد صاحب نے شاعری لکھنے کے بارے میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ گفتگو کے اختتام پر انہوں نے دریافت کیا کہ وہ اپنا کلام کسے چیک کراتا ہے۔

خالد نے رحمان صاحب کا بتایا۔

"ہاں' رحمان صاحب بھی کافی اچھے ٹیچر ہیں' مگر تمہیں شاعری پروفیشنل بندے کو چیک کرانی چاہیئے"۔

"مگر سر میں تو ایسے کسی بندے کو نہیں جانتا"

واہ' یہ تو وہی بات ہوئی ناں کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں' اپنے سکول میں محمود صاحب اعلیٰ پائے کے شاعر موجود ہیں۔ ان کی دو کتب بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں مگر تم کہتے ہو کہ تم کسی کو نہیں جانتے۔

دراصل سر' میرا ان سے تعارف نہیں ہے"۔

تو یہ بات کرو' میں تمہارا ان سے جلد ہی تعارف کرا دوں گا"۔

محمود صاحب سے تعارف ہوا' شناسائی ہوئی خالد کی شکل میں محمود صاحب کو ایک اور ذہین شاگرد مل گیا اور خالد کے تو جیسے وارے نیارے ہو گئے۔ خالد کی پہلی غزل جو محمود صاحب کی شاگردی میں اس نے لکھی تھی وہ اِنہوں نے اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے اخبار میں شائع کرا دی۔ ہر طرف خالد کی شاعری کی دھوم مچنے لگی۔ یار دوستوں نے اس کی غزل والی اخبار کی ایک کاپی رحمان صاحب کو بھی دی۔

رحمان صاحب تو سیخ پا ہوئے۔

''چور ہے خالد' یہ کبھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ میں اسے سبق سکھا دوں گا۔کل کا بچہ اور آج ہمارے برابر آن کھڑا ہوا بڑا آیا غالب کا شاگرد' احسان فراموش''۔

اور جانے کتنی دیر رحمان صاحب خالد اور محمود صاحب کی تعریفیں کرتے رہے۔

دو سال بعد رحمان صاحب کا دیوان شائع ہوا تو معلوم پڑا کہ موصوف اسی احسان فراموش خالد کی ایک غزل اپنے پہلے دیوان میں درج فرما چکے ہیں اور اُس خالد نے احسان فراموشی کرتے ہوئے اپنے استادِ محترم کو اپنی مزید غزلیں چوری نہ کرنے دیں۔

ایک طوطے اور طوطی کا گزر ایک ویرانے سے ہوا' وہ دم لینے کے لئے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی شاخ پر بیٹھ گئے۔ طوطے نے طوطی سے کہا''اس علاقے کی ویرانی دیکھ کر لگتا ہے کہ اُلوؤں نے یہاں بسیرا کیا ہوگا'' ساتھ والی شاخ پر ایک اُلو بیٹھا تھا، اُس نے یہ سن کر اُڈاری ماری اور اُن کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔علیک سلیک کے بعد اُلو نے اُن کو مخاطب کیا اور کہا'' آپ میرے علاقے میں آئے ہیں' میں ممنون ہوں گا اگر آپ آج رات کا کھانا میرے غریب خانے پر تناول فرمائیں''۔اُس جوڑے نے اُلو کی دعوت قبول کر لی۔رات کا کھانا کھانے اور پھر آرام کرنے کے بعد جب وہ صبح واپس جانے لگے تو اُلو نے طوطی کا ہاتھ پکڑ لیا اور طوطے کو مخاطب کر کے کہا'' اسے کہاں لے کر جا رہے ہو' یہ میری بیوی ہے'' یہ سن کر طوطا پریشان ہو گیا اور بولا'' یہ تمہاری بیوی کیسے ہو سکتی ہے ' یہ طوطی ہے اور تم اُلو ہو' تم ناانصافی کر رہے ہو'' اِس پر اُلو ٹھنڈے لہجے میں بولا'' ہمیں جھگڑے کی ضرورت نہیں 'عدالتیں کھل گئی ہوں گی۔ہم عدالت چلتے ہیں' وہ جو فیصلہ کرے گی' ہمیں منظور ہوگا' طوطے کو مجبوراً اُس کے ساتھ جانا پڑا۔جج نے دونوں طرف کے دلائل بہت تفصیل سے سُنے اور آخر میں فیصلہ دیا کہ طوطی' طوطے کی نہیں' اُلو کی بیوی ہے۔یہ سن کر طوطا روتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اُلو نے اُسے آواز دی'' تنہا کہاں جا رہے ہو' اپنی بیوی تو لیتے جاؤ'' طوطے نے روتے ہوئے کہا'' یہ میری بیوی کہاں ہے' عدالت کے فیصلے کے مطابق اب یہ تمہاری بیوی ہے'' اس پر اُلو نے شفقت سے طوطے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا'' یہ میری نہیں' تمہاری ہی بیوی ہے' میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بستیاں الوؤں کی وجہ سے ویران نہیں ہوتیں بلکہ اُس وقت ویران ہوتی ہیں جب وہاں سے انصاف اٹھ جاتا ہے۔''

خیالی عکس


مریم صدیقی (بی بی اے۔۴)


مریم صدیقی (بی بی اے۔۴)


محمد بلال (بی ای ٹی۔۳)


باغِ شگفتہ

میری آنکھوں کو یہ آشوب نہ دِکھلا مولا
اتنی مضبوط نہیں تابِ تماشا میری
میرے ٹی وی پہ نظر نہ آئے ڈسکو یا رب
"لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری"

جھوٹ ہی جھوٹ

جناب خرم سلیم عالمگیر۔شعبہ ای ای

یہ سچا واقعہ ہے اس لئے اس پر یقین مت کیجیئے گا۔آج سے کوئی دس سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں رات کو سو کر اٹھا اور کیلنڈر دیکھا تو وہ ۳۱ فروری ۲۰۱۵ء کی سہانی صبح تھی جبکہ گھڑی میں شام کے سات بجے تھے اور سورج طلوع ہو رہا تھا۔چونکہ سو کر اٹھا تھا اس لئے تھکن محسوس کر رہا تھا۔بھوک بالکل نہیں تھی چنانچہ پیٹ بھر کے کھانا پڑا۔باہر نکلا تو لوگ سڑکوں پر اپنی اپنی لین میں گاڑی چلا رہے تھے۔فروری کا آغاز تھا۔اس لئے کافی گرمی ہو گئی تھی۔میں نے جیکٹ پہن لی جو جسم کو کافی دیر ٹھنڈا رکھ سکتی تھی۔

میں اس شہر میں ۴۰ سال سے رہ رہا ہوں جبکہ میری تاریخ پیدائش ۱۹۷۷ء کی ہے۔سڑک پر اپنے پرانے دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ملک کے سیاسی حالات بہت مضبوط ہو گئے ہیں۔وزیرِ مشیر دن رات کام کر رہے ہیں اور عوام میں کوئی بھی غربت اور افلاس کا رونا نہیں روتا۔سب کو بنیادی ضروریات میسر ہیں۔لوڈشیڈنگ' دہشت گردی ختم ہو گئی ہے۔کیونکہ یہ تمام مسائل معمولی نوعیت کے تھے اس لئے میں نے اپنے دوست کی بات کا فوراً یقین کر لیا۔خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے اوپر نگاہ دوڑائی تو آسمان پہ چاند اور سورج اکٹھے چمک رہے تھے۔مگر یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون سا سورج ہے اور کون سا چاند، میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ ان میں سے کون سا چاند ہے تو اس نے کہا ابھی کل ہی تو وہ بیرون ملک سے پہلی مرتبہ ہمارے ملک آیا ہے۔اس لئے اسے نہیں معلوم۔

کچھ آگے روانہ ہوا تو شہر کا قبرستان آ گیا مردوں نے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا۔ایک مردے نے خیر سگالی کے طور پر یہ ایک سفید کفن مجھے تحفے میں دیا ایک گونگے مردے نے مجھے بتایا کہ چند دن پہلے دو مردے زندہ ہو گئے تھے۔ان میں سے ایک مردہ لنگڑا بھی تھا اور لنگڑے مردے کو ایک اندھے مردے نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔خیر کہانی اس طرح ختم ہوئی کہ دوسرا مردہ جو کہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا، اس نے سخت تعاقب کے بعد لنگڑے مردے کو پکڑ لیا۔دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی اور دونوں مردوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔میں نے گونگے مردے کے اس قصے پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔کیونکہ پچھلی مرتبہ بھی اس گونگے مردے نے یہی قصہ سنایا تھا۔

رات کو مردوں نے مجھے قبرستان کی رکھوالی پر بٹھایا اور خود شہر کی بتیاں دیکھنے روانہ ہو گئے۔

صبح ہونے والی تھی اور ایک اور دن اختتام پذیر ہوا۔اگلا دن جانے کیا احساسات لے کر آنے والا تھا۔۔۔۔۔!!

پڑھنا منع ہے

سید وقار حسن (بی ای ٹی ۔۵)

ارے ارے رکیئے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب؟؟ کیا آپ نے اس مضمون کے عنوان پر غور نہیں فرمایا؟ اگر غور فرمایا ہے تو مہربانی کر کے ایک مرتبہ مزید غور فرمالیجیئے۔ صاف صاف لکھا ہے کہ "پڑھنا منع ہے۔" اب آپ اسے مصنف کی عاجزی سمجھئے، صاف گوئی، حقیقت پسندی یا مجبوری کہ اس نے پڑھنے سے پہلے ہی آپ کو خبردار کر دیا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے اور اس مضمون کو پڑھنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس مضمون کو پڑھ کر آپ افلاطون یا سقراط تو بن نہیں سکتے اور اگر خدانخواستہ بن بھی گئے تو افلاطون اور سقراط سے مجھے شدید ہمدردی ہے۔

اس لئے میرا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ یہیں رک جایئے۔ اور مزید وقت ضائع مت کیجئے اور جو وقت ضائع کر چکے ہیں اس پر نادم ہو کر مزید وقت کا ضیاع مت کیجئے۔

لیکن یہ کیا؟؟ آپ تو اس مضمون کو نہایت انہماک اور دلجمعی کے ساتھ پڑھے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی دھن کے اتنے ہی پکے ہیں تو عقلمندی اسی میں ہے کہ آپ اس مضمون کو پورا پڑھ ہی ڈالئے اور اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔ بلکہ دوسروں کو بھی اس مضمون کے پڑھنے کی ترغیب دیں کیونکہ دم کٹی لومڑی سب کو دم کٹا ہی دیکھنا چاہتی ہے۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ اس کو جو کام کرنے سے منع کیا جائے وہ سب سے پہلے وہی کام سرانجام دیتا ہے بلکہ اس کو اپنا نصب العین ہی بنا لیتا ہے۔

اب شیخ صاحب کی ہی مثال لے لیجئے۔ کسی زمانے میں ہمارے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔ یا پھر شاید ہم ہی اُن کے پڑوس میں رہتے ہوں گے۔ خدا معلوم!! کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں .... نہایت حلیم الطبع اور خوش مزاج آدمی تھے۔ کھانے میں بھی زیادہ تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔ سادہ خوراک اور انکسار پسند شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی قسمت جو پھوٹی تو شوگر کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔

وہی شیخ صاحب جو میزبان کے دو تین سو یا کبھی کبھار دو تین ہزار مرتبہ اصرار کرنے پر کسی میٹھی چیز کو تکلفاً چکھ لیا کرتے تھے اب ہر میٹھی چیز کی طرف چیونٹی کی طرح دوڑے پھرتے تھے۔ کوئی باورچی خانہ، فرج، الماری، دکان حتیٰ کہ جیب میں رکھی ٹافی بھی ان کے شر سے محفوظ نہ تھی۔ جہاں کوئی میٹھی چیز دیکھی بغیر کسی ہچکچاہٹ و پریشانی فوراً دیدہ دلیری سے ہڑپ کر لی اور بعد میں اتنی معصوم شکل بنا لی جیسے پہلی مرتبہ کوئی میٹھی چیز کھانے کا اتفاق ہوا ہو۔

ویسے ان کی ان میٹھی کارستانیوں میں ان کا کچھ خاص قصور بھی نہ تھا۔ اس کا اندازہ صرف وہی مظلوم طبقہ لگا سکتا ہے جو شادی شدہ ہو۔ بے

چارے شیخ صاحب کی بیوی شکلاً تھانے دارنی، عادتاً استانی اور فطرتاً حیوانی واقع ہوئی تھیں۔ قیاس تو یہ بھی کہتا ہے کہ ان کا شجرہ نصب کسی نہ کسی پشت پر ہٹلر یا چنگیز خان سے ضرور ملتا ہوگا یا پھر ہلاکو خان سے تو ان کی کوئی نہ کوئی رشتہ داری ضرور ہی نکل آئے گی۔

جیسے ہی میاں کی بیماری کا علم ہوا ویسے ہی گھر سے ہر میٹھی چیز کا ایسے صفایا کر دیا جیسے مجرم واردات کے بعد تمام ثبوتوں کا صفایا کر دیا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح پڑوس کی چیونٹیوں نے شیخ صاحب کے گھر سے مایوس ہو کر میٹھے کی تلاش میں ہمارے گھر کی راہ پکڑی، اسی طرح شیخ صاحب بھی اکثر اوقات ہمارے گھر میں ہی پائے جاتے تھے۔ اکثر اوقات شیخ صاحب میٹھے کی تلاش میں باورچی خانے پہنچ جایا کرتے اور فرج سے کھیر، شاہی ٹکڑے، کسٹرڈ اور مٹھائی نکال کر بڑی بے اعتنائی سے چٹ کر جایا کرتے تھے اور ہم حسرت سے ان کا منہ ہی تکتے رہ جاتے اور جب تلک کھا کھا کر ان کا منہ بند نہ ہوتا، ہمارا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ جاتا تھا۔ ہم تو چلو جوں توں کر کے برداشت کر ہی لیا کرتے، مگر ہماری بیگم صاحبہ کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی۔

ویسے تو ہماری بیگم صاحبہ نہایت ہی نیک سیرت، خداترس اور نرم دل خاتون ہیں۔ لیکن شیخ صاحب کی روز روز گھر آمد اور میٹھے کی فرمائش کی وجہ سے ان کی خداترسی اور نرم دلی کی صفت رفتہ رفتہ معدوم ہوتی گئی اور انہوں نے باورچی خانے کی کڑی نگرانی کرنا شروع کر دی۔ ہر وہ جگہ جہاں شیخ صاحب کی پہنچ کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا، تالے میں بند کر دی جاتی جس کی چابیاں ہماری بیگم صاحبہ اپنے پاندان کی نچلی منزل کے ایک خفیہ خانے میں چھپا کر رکھتی تھیں۔

ویسے تو بیگم صاحبہ کے پاندان کے نزدیک پھٹکنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن اگر کوئی یہ معرکہ سر کر بھی لے تو پاندان میں سے کچھ تلاش کرنا محال تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاید اہرامِ مصر میں اتنے تہ خانے نہ ہوں گے جتنے خفیہ خانے ہماری بیگم کے چھوٹے سے پاندان میں تھے۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم کبھی کبھار بیگم سے آنکھ بچا کر ریزگاری کی تلاش میں پاندان کا پوسٹ مارٹم کیا کرتے تھے تو ہمیں ہمیشہ مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑتا اور ایک ٹیڈی پائی بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ شیخ صاحب لاکھ کوشش کے باوجود نہ ہی کبھی چابی تک پہنچ سکے اور نہ اس دن کے بعد سے انہیں کبھی باورچی خانے کی زیارت ہی نصیب ہوئی۔ البتہ باورچی خانے کے دروازے کو حسرت بھری نگاہوں سے ٹکٹکی باندھ کر کچھ یوں دیکھا کرتے تھے جیسے نوجوان طلباء گرلز کالج کے دروازے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ اکثر اوقات ہم بھی کئی کئی دن باورچی خانے کی شکل دیکھنے سے محروم رہ جاتے تھے۔ آخرکار ایک دن تنگ آ کر ہم بھی شیخ صاحب پر برس پڑے اور اگلا پچھلا سارا غصہ ان پر نکال دیا۔ شیخ صاحب بھی انا کے پکے تھے، انہوں نے ہم سے دوستی چھوڑ، پچھلی گلی میں ایک حلوائی سے دوستی کی داغ بیل ڈالی۔ کچھ ہی عرصے میں یہ دوستی اتنی مستحکم ہوگئی کہ شیخ صاحب یا تو حلوائی کے گھر پر یا اس کی دکان پر نظر آیا کرتے تھے۔

شیخ صاحب صرف ذات کے شیخ نہیں تھے بلکہ صفتاً بھی شیخ ہی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے جیب سے پھوٹی کوڑی بھی نہ خرچ کرتے اورحلوائی کی دو تین کلو مٹھائی کا روز صفایا کر جاتے تھے۔ بے چارہ حلوائی شریف النفس آدمی تھا۔ بار بار روپے کا تقاضا نہ کرتا لیکن اب کاروبار میں زیادہ مندی ہونے لگی تھی۔ حلوائی بھی معقول آدمی تھا اس نے شیخ صاحب سے دوستی تو نہ ترک کی البتہ مٹھائی کی دکان بیچ کر نمک پارے اور سموسے کی دکان کھول لی۔ مجبوراً شیخ صاحب کو ہی حلوائی کی رفاقت سے دستبردار ہونا پڑا۔

بعض مبالغہ آراء احباب نے تو شیخ صاحب کو ملک میں چینی کے بحران کا سبب تک قرار دے دیا۔ جب شیخ صاحب کی بیوی کو ان کی کارستانیوں کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے وہ محلّہ ہی چھوڑ دیا۔ اب بھی جب ہم کبھی کسی چیونٹی کو میٹھی چیز کی طرف لپکتے دیکھتے ہیں یا پھر باورچی خانے کے دروازے کو تالے میں بند پاتے ہیں تو یک لخت شیخ صاحب کا تصور خود بہ خود ہمارے دماغ میں گردش کرنے لگتا ہے اور ہم ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں۔

یہ ہے انسانی نفسیات جو انسان کو ہر وہ کام کرنے کے لئے اکساتی ہے جس سے اسے منع کیا جائے یا روکا جائے۔ ہر ممنوع کام میں انسان کو عجیب چاشنی اور لذت معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تجسس طینتِ انسانی میں مضمر ہے، جس کے تحت انسان منع کئے گئے کام کو کرنے کی جستجو کرتا ہے۔

کاش! ہم اس فلسفہ حیات سے اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی آشنا ہو گئے ہوتے تو کبھی بھی بی اے کے امتحان میں چار پانچ دفعہ فیل ہونے کا اعزاز حاصل نہ کرتے۔ ہمیں تو ہر اپنے پرائے نے ہمیشہ یہی تلقین کی کہ دل لگا کر پڑھو، خوب محنت کیا کرو اور یہ شعر بار ہا دھرایا

پڑھو گے، لکھو گے بنو گے نواب
کھیلو گے، کودو گے ہو گے خراب

اور بھرپور انداز میں ہمیں باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ تعلیم ہی اصل خزانہ ہے اور نواب بننے کے لئے یہ خزانہ بے حد ضروری ہے۔ ایک وقت تو ایسا آن پہنچا تھا کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ شاعر نے یہ شعر صرف اور صرف ہماری ذاتِ اقدس کے لئے ہی کہا ہے اور اگر ہمارا وجودِ خاکی اس دنیا میں نہ ہوتا تو شاعر یہ شعر کہنے کی جسارت کبھی نہ کرتا۔

خیر ہم لالچی تو تھے نہیں، ویسے بھی اللہ اور اس کے رسولؐ نے طمع وحرص سے سخت منع فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاجزی وانکساری ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لئے نہ ہی ہمیں نواب بننے کا شوق تھا اور نہ ہی علم کا خزانہ حاصل کرنے کا لالچ، اور تھوڑی بہت کھیل کود تو ہم بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے کر لیا کرتے تھے، تاکہ کھیل کود کر کے خود بے شک خراب ہو جائیں، لیکن دوسروں کے لئے باعث عبرت بن کر ان کو خراب ہونے سے بچا لیں۔

لیکن اگر کوئی خیر خواہ اس انداز میں ہمیں سمجھاتا کہ بیٹا اتنا مت پڑھا کرو، اپنے نازک دماغ پر اتنا بوجھ کیوں ڈالتے ہو؟ اپنی صحت دیکھو اور

ان ضخیم کُتب کا انبار!! کھیل کود پر توجہ دیا کرو۔۔۔تو پھر شاید ہماری فطرت ہمیں طلب علم کی جانب اکساتی (کیونکہ جس چیز کو انسان سے دور کیا جائے وہ اس کے قریب آنا چاہتا ہے)۔اور پھر شاید ہم بنی نوع انسان کی فلاح اور اپنی عاجزی کو پسِ پشت ڈال کر دولت علم حاصل کرنے کی جستجو کرتے۔

لیکن آپ کبھی اس مغالطے میں نہ رہیے گا کہ ہم شروع ہی سے فارغ العقل اور نکمے واقع ہوئے تھے۔ایسی بات ہرگز نہیں بلکہ ہمارے اندر تو شروع سے ہی کسی نیوٹن یا آئن سٹائن کی روح سوئی ہوئی تھی۔لیکن اپنی قسمتِ خوابیدہ کی طرح ہم نے کبھی بھی اس سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔کیونکہ ہم اتنے بدتہذیب تو ہیں نہیں کہ کسی کے آرام میں مخل ہوں۔اور اگر بیدار کر بھی دیتے تب بھی بی اے پاس کرنے کا خیال صرف ایک سہانا سپنا بن کر ہمارے دماغ میں گردش کرتا رہتا اور عملی جامہ نہ پہن پاتا۔کیونکہ نیوٹن یا آئن سٹائن کون سا بی اے پاس تھے؟ وہ تو ایک سیب تھا جس نے نیوٹن کو ایک نکمے طالب علم سے ایک عظیم الشان سائنس دان بنا دیا تھا۔اسی لئے ہم اکثر اوقات کالج جانے کے بجائے باغ میں سیب کے درخت تلے اس امید پر بیٹھا کرتے تھے کہ شاید کوئی سیب ہم پر بھی آ گرے اور ہمیں نیوٹن بنا دے لیکن ہم پر کوئی سیب نہ گرا۔پھر سوچا کہ منتظر فردا رہنے کے بجائے اپنی تقدیر خود بنانی چاہئے اس لئے ایک دن ڈنڈا اٹھایا اور سیب کے درخت پر بوچھاڑ شروع کر دی۔سیب تو بہت سارے گرے مگر کمبخت ایک بھی سر پہ نہ گرا چنانچہ ہم نیوٹن بننے سے بال بال بچ گئے،البتہ مالی کے پتھراؤ سے،بہت سارے پتھر ہماری کھوپڑی کا مقدر ضرور بنے۔ہم بھی اپنی دھن کے پکے تھے،سوچا کہ سیب شاید ہماری قسمت میں نہیں،ہوسکتا ہے کہ دورِ جدید کے نیوٹن کے لئے قسمت نے کوئی اور پھل مختص کر رکھا ہو۔اس لئے ہم آم' کیلے' امرود' ناشپاتی' غرض کہ ہر وہ پھلدار درخت جو ہمارے علاقے کے گردونواح میں پایا جاتا تھا،کے نیچے بیٹھے،مگر نیوٹن نہ بن سکے۔البتہ بیشتر اوقات درختوں کے نیچے بسیرا کرنے کی وجہ سے لوگ ہمیں پیر فقیر ضرور سمجھنے لگے تھے۔

ارے یہ کیا! آپ نے تو یہ مضمون پورا ہی پڑھ ڈالا،اب آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ یقیناً آپ نے اپنا وقت بالکل بھی ضائع نہیں کیا بلکہ آپ بہت زیادہ لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔مصنف کا شروع میں آپ کو مضمون پڑھنے سے منع کرنا صرف اس لئے تھا تاکہ آپ کے اندر اس مضمون سے متعلق تجسس پیدا ہو اور آپ اضطراب کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اس تجسس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔اب آپ ذرا خود سوچیں کہ اگر اس مضمون کا عنوان ہوتا ''پڑھنا ضروری ہے'' تو کیا آپ اس مضمون کو پڑھتے؟؟؟؟؟

تو پھر کیا! (افسانچہ)

سید شمس الحسن (مدیر۔ حصہ انگریزی)

تم ہی تو میری زندگی ہو، تم ہی تو میرا اوڑھنا، بچھونا اور کل کائنات ہو، تمہارے بغیر میری یہ دنیا ادھوری ہے، تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی ادھورا ہے۔ تمہارے بغیر دنیا کی یہ رنگینیاں میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں، تم میری زندگی بن چکی ہو، کیونکہ تمہارا ہی ساتھ مجھے جلا و دوام بخشتا ہے، زندگانی و جاودانی بخشتا ہے، تروتازگی و توانائی بخشتا ہے، احساسات و جذبات کے کرشمات سے روشناس کراتا ہے، عشق و محبت کے کرامات سے آشنائی بخشتا ہے، قدرت کی تخلیقات و تجلیات کا عکس تمہاری ہی وساطت سے تو مجھے نصیب ہوتا ہے۔ تمہارے بغیر میری دنیا کتنی سونی، کتنی اجیرن ہے، کتنی بے معنی اور کتنی مشقت طلب ہے۔ تمہارے بغیر نہ ہی نصابی سرگرمیوں میں دل لگتا ہے اور نہ غیر نصابی سرگرمیوں میں۔ کیونکہ تمہارا ساتھ ہی مجھے مکمل کرتا ہے۔ تمہارا ساتھ ہو تو سال کا ہر موسم میرے لئے موسم بہار ہوتا ہے۔ تمہارے دم قدم سے ہی تو میری توانائیاں دوگنا ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی جب تم چپکے سے کھو جاتی ہو تو مجھے کتنی اذیت ملتی ہے۔ اور تب میں تمہیں ڈھونڈنے کے لیئے مارا مارا پھرتا ہوں، تو لوگ مجھے اندھا، مجنوں اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم یہ سب صرف اپنی اہمیت جتانے کے لئے ہی تو کرتی ہو۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ میرے نزدیک تمہاری اتنی ہی اہمیت ہے۔ جتنی کہ مجنوں کے نزدیک لیلیٰ کی اہمیت تھی اور جتنی رانجھے کے نزدیک ہیر کی۔

تمہیں اچھی طرح ادراک ہے کہ یہ سب تمہاری عدم موجودگی کی وجہ سے ہوا۔ تمہارے اچانک یوں کھو جانے سے مجھے کتنی دقت ہوتی ہے۔ کتنے لوگوں کی باتیں سننی پڑتی ہے۔ راہ چلتے کتنے لوگوں سے Sorry کہنا پڑتا ہے۔ تمہاری عدم موجودگی میں میں تو مرجھا جاتا ہوں اور میری حالت یوں ہوتی ہے جیسے ریموٹ کنٹرول سے Battery نکال دی جائے یا چلتی گاڑی میں Fuel ختم ہو جائے یا بہار کے موسم میں خزاں آجائے۔

آج بھی تم مجھے یوں ہی ستا رہی ہو۔ کیونکہ میں نے ابھی Quiz کی تیاری بھی کرنی ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے بغیر Quiz کی تیاری میرے لئے ناممکن ہے۔

دیکھو تم اب مجھے مزید تنگ نہ کرو۔ میں تمہیں آخری بار Warn کرتا ہوں کہ اب اگر تم مجھے نہ ملیں تو۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔تو۔۔۔۔تو۔۔۔۔پھر کیا۔۔۔۔۔۔ میں بازار جا کر دوسری عینک بنوالوں گا۔

مریضِ عشق

کنول رانی (مدیر، حصہ اُردو)

کہتے ہیں کہ ایک صاحب عشق میں مبتلا ہو گئے۔ اور ان کے محبوب ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔۔۔ ایک دن ان کے مطب میں تشریف لے گئے۔۔۔

ڈاکٹر:۔ آیئے آیئے تشریف رکھیئے۔ ذرا نبض دکھایئے۔

مریض:۔

فقط ہاتھوں کو نہ دیکھو ، کبھی آنکھیں بھی پڑھو
کچھ سوالی بڑے خوددار ہوا کرتے ہیں

ڈاکٹر:۔ آپ کو کیا عارضہ لاحق ہے؟

مریض:۔

یہاں ہے تپ عشق میرے خونِ جگر میں
ہزار جلوے تڑپتے ہیں میری خاموش نظروں میں

ڈاکٹر:۔ آپ کو یہ مرض کتنے عرصے سے لاحق ہے؟

مریض:۔

کچی عمروں میں بھٹکنے کا سبب ہے اتنا
عمر کم ہوتی ہے اور جذبات بہت

ڈاکٹر:۔ آپ کے خاندان میں کبھی کسی کو یہ مرض لاحق ہوا؟

مریض:۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اُس کی زلفوں کے اسیر ہوئے

ڈاکٹر:۔ پہلے کوئی علاج معالجہ کرایا؟

مریض:۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل
وہ دکان اپنی بڑھا چلے

ڈاکٹر:۔ مرض میں کب افاقہ محسوس کرتے ہیں؟

مریض:۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میؔر ہوئے
سب اُس کی زلفوں کے اسیر ہوئے

ڈاکٹر:۔ اگر ایسے ہی آپ کو سکون ملتا ہے تو آپ وہیں کیوں نہیں چلے جاتے؟

مریض:۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

ڈاکٹر:۔ آپ عام طور پر کیا محسوس کرتے ہیں؟

مریض:۔

اتنے سہے ہیں غم کہ گھبرا گیا ہوں میں
اس زندگی کے بوجھ سے اُکتا گیا ہوں میں

ڈاکٹر:۔ آپ تسلی رکھیں آپ بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔!!

مریض:۔

اچھے مسیحا ہو مریض کہتے ہو کہ حال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو کہ حال اچھا ہے

ڈاکٹر:۔ آپ اپنے علاج کے لئے عبادت کو سہارا بنائیے!

مریض:۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر:۔ مہربانی فرما کر میرا وقت ضائع مت کریں اور یہاں سے تشریف لے جائیں

مریض:۔

اتنی نفرت سے خُدارا مت دیکھ ہمیں
لے !اب تیری بزم سے ہم آپ نکل جاتے ہیں

کامسیٹس کی مشہور بیماریاں

حسن محی الدین (بی بی اے۔۷)

رزلٹوریا(Resultoria)

یہ ایک ایسی بیماری ہے جو امتحانات کے بعد عام پائی جاتی ہے اس بیماری کا وائرس کسی کمزور دل شخص کی جان بھی لے سکتا ہے یہ بیماری صرف ایک جملے سے پھیلتی ہے۔

''رزلٹ آرہا ہے''

علامات:۔

اس بیماری کی وجہ سے لڑکوں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور لڑکیوں کی آنکھیں پُرنَم ہو جاتی ہیں جس دن یہ بیماری ظاہر ہوتی ہے وہ دن نہایت سنجیدگی سے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزرتا ہے۔ بقول شاعر

کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے

لڑکوریا(Larkoria)

یہ بیماری ویسے تو سارا سال پائی جاتی ہے اور اس کے جراثیم ہر قسم کے طلبہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔لیکن سمسٹر کے شروع کے دنوں میں یہ بیماری طلبہ میں بہت عام ہو جاتی ہے۔

علامات:۔

ہر نئے سمیسٹر کے اوائل میں طلبہ اِس بیماری میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔خود کو سمارٹ، دانا اور فنکار سمجھتے ہیں اور ہر لڑکی سے ''دوستی'' ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اٹینڈڈائس(Attendius)

یہ بیماری سب سے خطرناک ہے کیونکہ اس بیماری کا پتہ سارا سمیسٹر نہیں چلتا، خبر اس وقت ہوتی ہے جب سارا سمسٹر ضائع ہو جاتا ہے۔اور اساتذہ کی منت ترلے بھی کام کے نہیں رہتے۔

علامات:۔

اٹینڈنس شیٹ کو دیکھ کر کلاس میں ہو کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور سب چوکنے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔حالانکہ سارا لیکچر سو کر گزارتے ہیں یا پھر جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے میں۔۔۔۔۔

غزل

فرحان خان (بی ای ٹی۔۸)

کیا ضروری ہے ہر غزل ہی تازہ ہو
اور اِس کیاری میں ' پھول بھی تازہ ہوں

بے بسی دیکھنا جو مقصود ہو طلبہ کی
آ کے کامسیٹس میں دیکھئے ' تو کچھ اندازہ ہو

روز پٹتے ہیں ہر رنگ کی سینڈل سے
کونسی لڑکی ہے جو آپ کی دلدادہ ہو

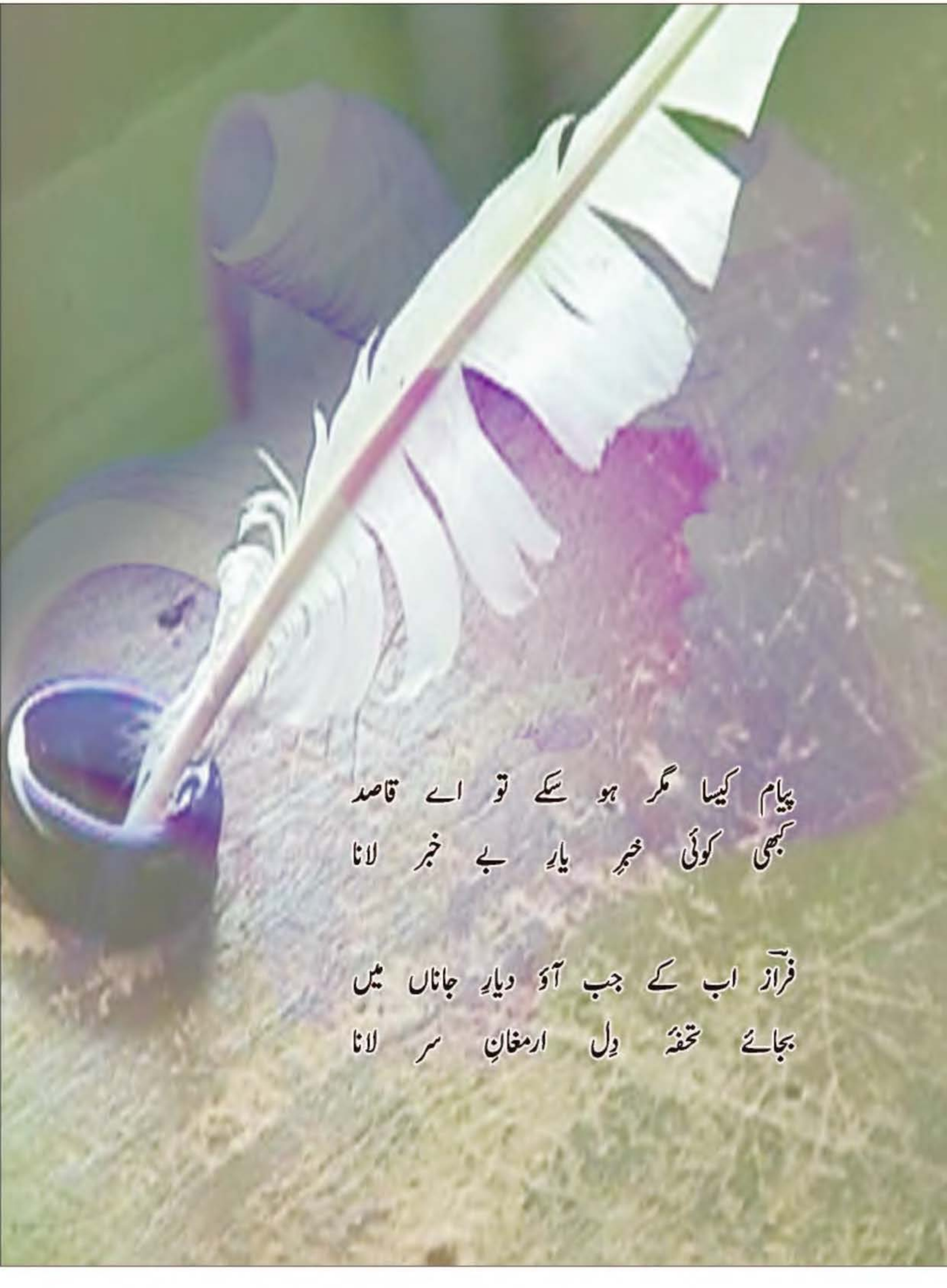
ماما پاپا کا تو جھگڑا ہی اِس بات پہ ہے
چینی ہو چائے میں کم ' کھانے میں نمک زیادہ ہو

کامیاب شادی کا راز اس میں ہی پنہاں ہے
کہ لڑکی تو فیشن ایبل ہو اور لڑکا سادہ ہو

احتیاط لازم ہے ، اُس کی گلی سے گزرتے فرحاںؔ
نجانے اُس ظالم کا بھائی، کتنا ڈاڈھا ہو

شعروسُخن




پیام کیسا مگر ہو سکے تو اے قاصد
کبھی کوئی خبرِ یارِ بے خبر لانا
فرازؔ اب کے جب آؤ دیارِ جاناں میں
بجائے تحفۂ دِل ارمغانِ سر لانا

غزل

سید نبیل حسن (مدیر اعلیٰ)

عجیب چیز ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں
کسی کا ملنا اور ملتے ہی رگِ جاں ہونا

تمہارے وصل کی خواہش بھی اک دیوانگی ہے
جیسے زمین و آسماں کے ملن کا امکاں ہونا

اس کے وجود میں کس قدر تفاوت ہے
سمٹے تو مکینِ دل پھیلے تو کہکشاں ہونا

وہ آپ اپنی مثال ایک ہی تخلیق خالق ہے
کیسے ممکن ہے کسی اور کا صورت جاناں ہونا

جس کو میں نے چاہا وہ مجھے مل بھی گیا
کتنا اچھا لگتا ہے غوطہ زنِ گماں ہونا

کہو نبیلؔ تم کو کیسا لگتا ہے؟
اس عالم عیاں میں اک رازِ نہاں ہونا

غزل

راجہ محمد حسیب (مدیر،حصہ اُردو)

بناکر کسی کو اپنا ، ہو کر کسی کا دکھا دیا
میرے دل کی دنیا اجاڑ کر مجھے اجنبی بنادیا

تجھے خبر ہے تو نے کیا کیا؟ میرے ساتھیا میرے ہمنوا!
جو چل دیئے تھے سفر پہ ، توکیوں ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا؟

پھر یوں ہوا کہ ایک دن میرا راستہ ہی بدل گیا
جسے ڈھونڈنے چلاتھا میں ، وہ نشاں ہی تو نے مٹادیا

میری شاعری کا لفظ لفظ ، تیرے حسن سے تھا ڈُھلا ہوا
دھندلا گئے میرے لفظ اب ، کیوں حُسن تو نے چھپا دیا؟

میں اب تلک ہوں بے قرار ' میرا پیار مجھ کو ملا نہیں
ان چاہتوں کا تو نے پھر کیوں سلسلہ جدا کیا؟

غزل

محمد رضا سرگانہ (نائب مدیر اعلیٰ)

ے کدوں میں تو جام چلتے تھے
مندروں میں بھی عام چلتے تھے

بن ہمارے تو فرق کچھ بھی نہیں
دُنیا کے پھر بھی کام چلتے تھے

بس یہیں ہمسفر نہ رک جانا
بنا تُمہارے کہاں صبح و شام چلتے تھے

یہ کیا فریب دے گئی دنیا پھر
اب یہ سمجھے ہیں کہ دام چلتے تھے

اب مروت بھی نہیں رہی یہاں تو
اس سے پہلے تو نام چلتے تھے

آج گردش میں ہے یوں وطن میرا
قبل ہم سُوئے بام چلتے تھے

ہم پریشاں رضاؔ رہے نہ تھے
ہاتھ ان ؑ کا جو تھام چلتے تھے

غزل

کنول رانی (مدیر، حصہ اُردو)

شکایت ہے دل سے کوئی بھاتا کیوں ہے؟
جسے پا نہیں سکتا ، اُسے چاہتا کیوں ہے؟

روز ہی ملتے ہیں خوابوں میں ہم دونوں
آتا ہے میرے پاس تو پھر جاتا کیوں ہے؟

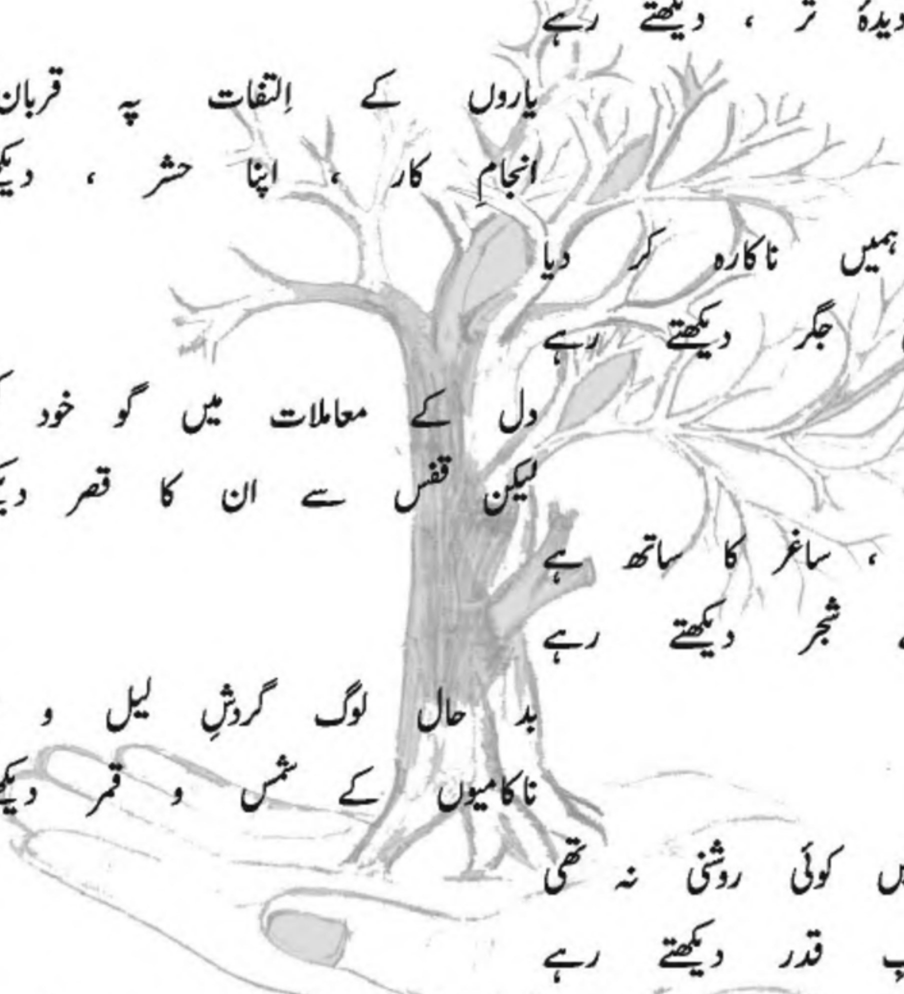
اشکوں کو لیے حالِ دل کہنا ہے اُسے
چاہتے ہوئے بھی دِل کو دُکھاتا کیوں ہے؟

گر وہ گرفتارِ محبت ہے تو پھر
مجھے دیکھ کے نظروں کو جھکاتا کیوں ہے؟

قُربِ منزل ہے ساتھ میں دوری بھی کنولؔ
قیامِ سرائے زیست کوئی چاہتا کیوں ہے؟

داستانِ حیات

جناب ذوالقرنین جعفری۔ شعبہ سی ایس



سمندروں کے مدّ و جزر دیکھتے رہے
سب لوگ ، میرا دیدۂ تر ، دیکھتے رہے

یاروں کے اِلتفات پہ قربان جایئے
انجامِ کار ، اپنا حشر ، دیکھتے رہے

فکرِ معاش نے ہمیں ناکارہ کر دیا
محرومیوں کے داغِ جگر دیکھتے رہے

دل کے معاملات میں گو خود کفیل تھے
لیکن قفس سے ان کا قصر دیکھتے رہے

یادوں کا سلسلہ ہے ، ساغر کا ساتھ ہے
ناکام حسرتوں کے شجر دیکھتے رہے

بد حال لوگ گردشِ لیل و نہار میں
ناکامیوں کے شمس و قمر دیکھتے رہے

مایوسیوں کے شہر میں کوئی روشنی نہ تھی
اپنا نصیب ، شبِ قدر دیکھتے رہے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
ہم وحشتوں کے برگ و ثمر دیکھتے رہے

اِک شوق کی تکمیل میں گم گشتہ جعفریؔ
بے نام منزلوں کے شجر دیکھتے رہے

غزل

احمد ذیشان (بی ای ٹی۔۵)

اُداسیوں کے درمیاں کچھ اِس طرح گھرا ہوں میں
اِک آگ میں جلا ہوں میں ، اک دشت میں پھرا ہوں میں

لہریں ملیں کِنارے سے پھر لوٹ کر جاتی ہیں کیوں
ساحل پہ رک کے دیر تک یہ سوچتا رہا ہوں میں

منزل سے ہوں نا آشنا ، رستے میں ہیں کانٹے مگر
سب غم بُھلا کر زندگی کو ڈھونڈتا رہا ہوں میں

جب خوش تھا میں ، تو سارا جہاں تھا ہمسفر میرا
اب غم کے موسم میں کوئی ساتھ نہیں ، تنہا ہوں میں

اُلجھا ہوا انداز ہے ، اُلجھی ہوئی میری شاعری
ہر خواب شاؔئی توڑ کر پھر جوڑتا رہا ہوں میں

غزل

عمر چوہدری (بی بی اے۔۸)

لالیِ جگر سے کوئے یار کا نکھرنا دیکھو
پارہ پارہ کرچی کرچی میرا بکھرنا دیکھو

سراپا منقسم ہے روح و وجود میرا
نفی میں جنبش تو نظروں کا مکرنا دیکھو

میری تحریر و تقریر کا محور جو تم ہو
تو لفظوں کا سنگھار ، جملوں کا سنورنا دیکھو

میری آہ اہل چمن جو سن لیں یارو
تم گلوں کا چمن سے بچھڑنا دیکھو

عؔمر بے رنگ ہے زیست ، جو حالات ہوں یکساں
کبھی انکا سنورنا ، اور کبھی بگڑنا دیکھو

غزل

محمد مزمل مشتاق (بی سی ای۔۵)

اک تم ہی نہیں اکیلے اس جہاں میں آج
چاند بھی بہت ہے تنہا آسماں میں آج

ایک وقت تھا کہ ڈرتا تھا ہجر کے لمحوں سے
اب کہاں ہو تم ، کیا پتہ ، ہوں کہاں میں آج

پہلے تو میرے آنسوؤں کو نہ پونچھتے تھے وہ
کیا نظر آ گیا ان کو اس آب رواں میں آج

بات کرتا ہوں تو ہچکی سی بندھ جاتی ہے
کس طرح تمہیں سناؤں اپنی داستاں میں آج

مزمّل تجھ کو سننے میں محو ہیں کیوں سب ہی
کچھ تو خاص بات ہے ، تیرے اندازِ بیاں میں آج

غزل

محمد ذیشان حیدر (بی بی اے۔۳)

تیری آنکھوں میں سپنا بن کے آنا بھول جاتا ہوں
تیری پلکوں کے پہلو میں سَمانا بھول جاتا ہوں

تیرے مَہ ِوش سے رُخساروں نے کچھ ایسا کیا جادو
تیری جانب جو ہوں نظریں جُھکانا بھول جاتا ہوں

تمہیں جب یاد کرتا ہوں تمہی کو سوچتا ہوں پھر
تمہاری یادمیں سب دوستانہ بھول جاتا ہوں

تیری یادوں کی محفل میں ہوں اب ساقی محفل
جو پیمانہ میں بھرتا ہوں ' پلانا بھول جاتا ہوں

زمانے نے کہا ، اس جھیل میں ڈوبو گے تم اِک دن
تیری قاتل نگاہوں میں ' زمانہ بھول جاتا ہوں

محبت سچے دل کی ہے 'محبت تم سے ہی کی ہے
مگر اے جانِ جاں تم کو بتانا بھول جاتا ہوں

محبت پھر نہیں ہوگی

ساجد رحیم شیخ (بی ای ٹی۔۸)

لکیروں میں اگر ہوتی
تو میں قسمت مٹا دیتا
اگر اتنا ہی آساں تھا
تو میں تجھ کو بھلا دیتا
مگر اس راہ میں راہیں
سہل اتنی نہیں ہوتیں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ منزل بھی نہیں ملتی
اور راہیں بھی نہیں کھوتیں
کہ ان راہوں میں ہم نے اک نیا ہی باب دیکھا ہے
کہ جلتا رات کی خنکی میں بھی ماہتاب دیکھا ہے
سہل اتنا نہیں ہوتا
یوں راہِ عشق میں چلنا
ہجر کی آگ میں جلنا
لبِ خاموش کی آواز دل کے کان سے سننا
کہ ساری رات بس ردائے خواب ہی بننا
مگر کچھ اور دیکھا ہے
یہاں کچھ اور دیکھا ہے

دھنک میں پیار کی ہم نے
کہ رنگ اک اور دیکھا ہے
محبت میں کسی کا اور ہی کچھ طور دیکھا ہے
مگر اب کچھ نہیں کہنا
اسے اب کچھ نہیں کہنا
فقط اتنا ہی کہنا ہے
کہ یوں پھر سے نہیں کرنا
اسے گر پیار کہتی ہو
خدارا پھر نہیں کرنا
کہ جیون بیت جائے گا
کہ دن پھر سے وہی ہوں گے
کہ راتیں بھی وہی ہوں گی
مگر یہ جان لو جاناں
مجھے اتنا ہی کہنا ہے
محبت پھر نہیں ہوگی!
محبت پھر نہیں ہوگی!

بُرا مان گئے۔۔۔۔

خواجہ باسط الرحمن خان (بی بی اے۔٦)

اُن کو دِل میں جو بسایا تو بُرا مان گئے
حالِ دل ہم نے سُنایا تو بُرا مان گئے

ہر روز ستاتے تھے وہ ہم کو لیکن
ایک دن ہم نے ستایا تو بُرا مان گئے

ہماری محبت پہ بھی اُن کو بد گمانی رہی
پیار سے جب بھی بُلایا تو بُرا مان گئے

اِک عجیب سی دوری رکھی تھی اُس نے
فاصلہ ہم نے بڑھایا تو بُرا مان گئے

یہی اعتراض رہا کہ حمایت نہیں کرتے
قصور باسطؔ نے بتایا تو بُرا مان گئے

گلہ (خالق سے مخلوق کا)

محمد رضا سرگانہ (نائب مدیر اعلیٰ)

راستے تو کئی دکھاتا ہے
دوش بھی تُو مِرا ٹھہراتا ہے

اے خدا جب تباہ ہی کرنی ہیں
پھر کیوں ، محفلیں سجاتا ہے

بھیج کر مے کشوں میں تو مجھ کو
پھر پیاسا کیوں بُلاتا ہے؟

مر رہے ہیں جو لوگ مسجد میں
دین تیرا ، کیا یہی سکھاتا ہے . . . . .؟

سچ بولیں تو زباں کٹتی ہے
پھر شاہ زہر بھی پلاتا ہے

مار کر ٹھوکریں غریبوں کو
گاڑی والا تو مسکراتا ہے

کہیں تو بھوک آنکھ سے ٹپکتی ہے
اور کوئی روز KFC میں جاتا ہے. . . .؟

خودکشوں کے دھماکے ، ارے معاذاللہ
کیا یہ راستہ جنتوں کو جاتا ہے. . . .؟

ہیں تیرے پیروکار ہم ، کہ نہیں. . . . .؟
انگریز ہی تجھے ، کیوں بھاتا ہے.....؟

زندگی کے رستے پر

سید نبیل حسن (مدیر اعلیٰ)

زندگی کے رستے پر
انسانوں کے سمندر میں
یوں تو کئی چہرے ہیں
پر سب کے سب اندھیرے ہیں
ایک چہرہ ان میں مگر
روشنی کا منبع ہے
دل جس سے ملتا ہے
جو مثلِ پھول کھلتا ہے
جس میں ہے انجانی کشش
اور ہے ان دیکھی تپش
رعبِ حُسن سے پُر ہے
روح تک اترتا ہوا سُر ہے
وہ جو ایک چہرہ ہے
انسانوں کے سمندر میں
سب سے اہم جزیرہ ہے
سفرِ عشق طے کر کے
اُس تک پہنچنا ہے
اس تک پہنچنے میں

اک سمندر سرِ راہ ہے
وہ سمندر بھی کیا ہے
آگ و خوں کی جا ہے
رتجگوں کے ساحل سے
آنسوؤں کی کشتی پر
صبر و وفا کے چپو سے
اس کو پار کرنا ہے
وصلِ یار کرنا ہے!
زندگی کے رستے پر
انسانوں کے سمندر میں!!!

جب تم میرے تھے ہی نہیں

سید شمس الحسن (مدیر، حصۂ انگریزی)

جب تم میرے تھے ہی نہیں
تو میں کیوں تمہارے بچھڑنے پر
ایک شجر سایہ دار تلے
رویا تھا!
تمہاری بے وفائی پہ
تمہاری عہد شکنی پہ
اپنی ہی سودائی پہ
کیوں یہ اشک ٹپکے تھے
وہ خوشگوار احساس ہی تھا
جب میں سے تم اور تم سے میں
ڈھل گئے تھے
جب تم میرے تھے ہی نہیں
وہ احساس بھی کیا اپنا تھا
وہ احساس جو
تمہاری محبت میں میں نے پایا تھا
وہ کیونکر میرا ہو
وہ کیونکر اپنا ہو
وہ کیونکر سانجھا ہو

آج پھر سے جب بہار آئی
تو احساس کی اس حدت سے
جذبات کا تلاطم پھر سے
کسی بحر بیکراں کی مانند
آنسوؤں کی شکل میں
بہہ گیا!
کیوں بہہ گیا
جب تم میرے تھے ہی نہیں
تو میں کیوں تمہارے بچھڑنے پر
پھر سے آج اک شجر سایہ دار تلے
خزاں رت جمائے بیٹھا ہوں
پھر سے آج رویا ہوں!

Vacancy

محمد عدنان (بی سی ای۔۴)

اِک لڑکی!
جو میرے دل کے دفتر میں
جاب لینے آئی تھی
وہ اپنے حُسن
اپنی اداؤں میں
بہت ہی کوالیفائیڈ تھی
اپنی بغل میں تھامے
دوپٹے کی فائل میں
شرافت کی ڈگری بھی ساتھ لائی تھی
نظروں کے انٹرویو میں
وہ تھوڑی سی Tense تھی
میں نے سیلری میں
اپنی وفائیں پیش کیں
وقت کے ساتھ ساتھ
ہم آہنگی کے بارے میں
تھوڑا سا اُس کو بریف کیا
میں نے فیصلہ کیا
تھوڑی دیر میں
اس سے سائن کروانے ہی والا تھا

اور زندگی بھر کا بندھن
باندھنے ہی والا تھا
کہ
اچانک
میرے خاندان کی
بہت بڑی سفارش آئی
روایات کے PA نے
اُس پر اپنی مہر لگائی
اور پھر!
میرے دل کے دفتر میں
کسی اپنے کو جاب مل گئی
آج برسوں بعد ---
میں جب ریٹائر ہو رہا ہوں
زمانے میں زائد ہو رہا ہوں
مجھے وہ لڑکی بہت یاد آتی ہے
جو
میرے دل کے دفتر میں
جاب لینے آئی تھی

کاغذ

محترم جناب تصور عباس۔شعبہ ای ای

تیری یاد کے چھوٹے چھوٹے کاغذ
جو تو نے مجھ کو لکھے تھے
کل رات وہ میں نے پھاڑ دیئے
پھر ان کو مسل کر ہاتھوں سے
ان ہاتھوں سے جو بھول گئے
تیرے ہاتھ کی نرمی بھول گئے
ان آنکھوں میں دفنا آیا
جو آنکھ کا کاجل بھول گئیں
تیری یادوں کے سارے قصے
میں نے اپنے ذہن سے محو کئے
یہ عہد کیا خود اپنے سے
وہ قصے نہ دُھراؤں گا
وہ باتیں نہ دُھراؤں گا
جو تو نے مجھ سے کی تھیں کبھی
پر دل کی خلش اک باقی تھی
کوئی کاغذ کا ٹکڑا اب بھی
میری روح بدن کے اندر تھا
وہ بے جاں کاغذ کے ٹکڑے
جو اُس نے ہاتھ سے لکھے تھے

اس کورے چٹے کاغذ پر
جو باتیں اس نے لکھی تھیں
وہ ساری میں نے پڑھ لیں تھیں
اور یاد بھی شاید کر لی تھیں

خواہش

نزہت نذر (بی بی اے-۸)

کُچھ خاموشی میں کہی گئی باتیں
لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ!
احساسات میں ڈوبے چند جملے
نغمے، غزلیں اور کچھ نظمیں
میری سوچ کے وہ سبھی زاویے
جو تُجھ سے شروع ہوئے
اور تُجھ ہی پہ ختم ہوئے!
میری دھڑکنوں کے تمام ربط اور سوز و ساز
جو تیرے خیال، تیرے تصور سے نغمہ بنے،
جو تیرے گمان کی روشنی سے معلّٰی بنے،
جو تیرے تکلّم کی چاشنی سے معتبر ٹھہرے،
جو تیرے لَمس کی حدت سے شدت پائیں،
جو تیرے وجود کی عاجزی سے عزیزِ جاں ٹھہرے!
جو مِل جائیں تو شُکر مناؤں
اپنا دِل سمیٹوں اور خوشی مناؤں!

یہ مان اب بھی باقی ہے!
کُچھ اِمکان اب بھی باقی ہے۔
گر نہ رہا ساتھ باقی!
احساس تب بھی باقی ہے۔
سو جان لو تم،
حُرمت لفظ سے جُڑے سب رستے
آج بھی تُمہاری طرف کو جاتے ہیں!!!

مریم صدیقی (بی بی اے-۲)

خواہش

عمیر لطیف (بی سی ای-۴)



اے میرے ہم نشیں!
کبھی ایسا بھی ہو
کہ یہ جسم و جاں
تیرے اپنے تو ہوں
مگر
جب تو دیکھے
کوئی آئینہ
تو وہ آئینہ
کرے چہرا میرا
تیرے روبرو
جو تو کرے کبھی گفتگو
تو اس میں ہو ایسی ادا
کہ جو سنے وہ کرے گماں
کہ تو....!! تجھ میں نہیں ہے
بس میں.......
میں ہوں وہاں!
میں ہوں۔۔۔

پس منظر
سید اویس شاہ (بی ای ٹی-۷)

نئی روشنی

احمد اسفندیار (ایم بی اے۔۴)

نئی روشنی سے اُڑی سادگی
ہے بے پردگی شانِ آزادگی
نہ سر پر دوپٹہ نہ رخ پر نقاب
نہ عصمت کی عظمت نہ پاسِ حجاب
چلیں سیر کو کر کے سولہ سنگھار
پھریں چست جیسے طیورِ بہار
وہ پلکوں کی شوخی کہ جھکتی نہیں
نگاہوں کی بجلی کہ رکتی نہیں
آداب اغیار میں کیونکر آئے کمی
کہ ابا ہیں ڈیڈی، تو امی ممی
سلام علیکم ہے گڈ مارننگ
سہیلی، سکھی بن گئی ڈارلنگ
لبھاتی پھریں گنگناتی پھریں
نئی دھن نئے گیت گاتی پھریں
جو ہے طاق سے تنگ آفاق ہے
نہ مذہب نہ تہذیبِ اخلاق ہے

غرور نمائش بھی ہو شرمسار
یہ ہیں چلتے پھرتے حسیں شاہکار
دوپٹوں کی وہ لہلاتی اڑان
غضب کا وہ جلوہ غضب کی اٹھان
جدھر سے گزر جائے پریوں کی فوج
ہوا میں ہو خوشبو کی لپٹوں کی موج
پکانے کو کُک ہے کھلانے کو نرس
لگانے کو پوڈر اٹھانے کو پرس

کردار

عدیل طاہر (بی ای ٹی۔۵)

اِک شب مُجھے خواب آیا
جیسے روح کو میری قرار آیا
میں جارہاہوں وہاں
جہاں سے مُجھے پیغام آیا
میں دیکھتاہوں اُس کو
جِس سے اشک میں میرے غُبار آیا
پھر سوچتاہوں رُک کے
میں آخر یہاں کیوں آیا۔۔۔؟
پھر زندگی کا میری احوال آیا۔۔۔!!
ہاتھ میں میرا نامۂ اعمال آیا۔۔۔!!
دیکھتے ہی اُس کو!
جہنم کا سوال آیا
پھر کردار مُجھے اپنا یاد آیا
کہا مُجھ سے، کِسی نے عدیؔل
کیوں۔۔۔!!
"گناہوں کا اپنے، خیال آیا۔۔۔!!"


خراجِ تحسین

فرازؔ، اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دِن کٹ رہے ہوں، یوں بھی نہیں

لب و دہن بھی مِلا، گفتگو کا فن بھی مِلا
مگر جو دِل پہ گزرتی ہے، کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا غلام ہوں بھی نہیں

میری زبان کی لُکنت سے بد گماں نہ ہو
جو تُو کہے تو تجھے عُمر بھر مِلوں بھی نہیں

دُکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اِسی دِیار کا میں بھی ہوں، اور ہوں بھی نہیں

فرازؔ جیسے دِیا قُربتِ ہوا چاہے
تُو پاس آئے تو ممکن ہے، میں رہوں ہی نہیں

(احمد فرازؔ)

احمد فرازؔ، ایک عہد ساز شاعر

محمد محسن حکیم (ایم بی اے۔۱)

سید احمد شاہ ۱۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سید احمد شاہ ہیں جنہیں دنیا احمد فرازؔ کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ اگرچہ آج وہ ہم میں نہیں، لیکن اُن کی شاعری آج بھی اُسی طرح زندہ و تابندہ ہے اور رہے گی۔

فرازؔ نے شاعری اپنے سکول کے زمانے سے ہی شروع کر دی تھی۔ وہ اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ، ایڈورڈ کالج پشاور، اور پشاور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ احمد فرازؔ کے والد مرحوم بھی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے جو کہ اُن کی اِس وقتاً فوقتاً شاعری کے حوالے سے تربیت کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ فرازؔ کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدلؔ، حافظؔ، سعدیؔ کے علاوہ غالبؔ کی فارسی شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ اس ماحول نے ان کے شعری اسلوب پر بہت ہی گہرا اثر ڈالا۔ احمد فرازؔ نے غزل کا تعارف ایک نئے انداز سے کرایا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ احمد فرازؔ کی غزل دراصل صنفِ غزل کی تمام پیشتر روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ انداز کا نام ہے، تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

فرازؔ اپنے پہلے شعر کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب اُن کے والد صاحب اُن کے اور اُن کے بھائی کے لئے عید کا جوڑا لائے تو انہیں اپنا جوڑا پسند نہ آیا، جبکہ ان کے بھائی کے کپڑوں نے انہیں نہایت متاثر کیا۔ اس پر انہوں نے یہ شعر کہا۔

لائے ہیں سب کے لئے کپڑے سیل سے
لائے ہیں ہمارے لئے کمبل جیل سے

پھر اس کے بعد اُن کی والد صاحب سے سخت لڑائی ہوئی اور وہ تعلیم حاصل کرنے اور شاعری کی نیت سے گھر چھوڑ کر پشاور آ گئے۔

سکول کے زمانے کا ایک واقعہ وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''سکول میں میری ایک لڑکی سے دوستی تھی۔ میرے والدین نے مجھے کہا کہ اس سے ریاضی سیکھوں۔ چونکہ میں ریاضی میں کافی کمزور تھا، لیکن مجھے ریاضی اُس وقت کچھ بھی نہ لگتی جب وہ مجھ سے کہتی کہ چلو بیت بازی کھیلتے ہیں۔ وہ اس میں کافی مہارت رکھتی تھی اسی لئے مجھے کافی اشعار اس کے لئے یاد کرنے پڑے۔ لیکن میں پھر بھی ہار جاتا تھا اور پھر جب میں نے خود شعر کہنے شروع کر دیئے تو میں اس سے کبھی نہیں ہارا''۔

احمد فراز نے جن ادبی رسائل و جرائد کی ادارات کے فرائض سرانجام دیئے ان میں داستان، خادم اور اشتیاق شامل ہیں۔ ان کی پہلی تصنیف

''تنہا تنہا'' ۱۹۵۰ء کے عشرے میں شائع ہوئی اس کے علاوہ ان کی مشہور تصانیف میں ''میرے خواب ریزہ ریزہ'' بے آواز گلی کے کوچوں سے' پس انداز موسم' اور شہرِ سخن آراستہ ہے، شامل ہیں۔

احمد فرازؔ کی شاعری نے جہاں ان کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا، وہاں پر ان کے لئے لاتعداد ایوارڈز کے دروازے وا کئے۔ ان کے قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز کی فہرست بہت طویل ہے ان میں پہلا کیفی اعظمٰی ایوارڈ ۲۰۰۲ء، یو اے ای ٹی وی کمال فن ایوارڈ ۲۰۰۴ء، انڈیا ملینیم میڈل آف آنرز، یو ایس اے شامل ہیں۔

قومی سطح پر انہوں نے ستارۂ امتیاز برائے ادب' ہلالِ امتیاز برائے ادب کے علاوہ لاتعداد دوسرے ایوارڈز حاصل کئے۔

فرازؔ کی شاعری کے بہت سی بین الاقوامی زبانوں میں تراجم کئے گئے۔ ان میں انگریزی' فرانسیسی' ہندی' سویڈیش' روسی اور جرمن زبان شامل ہیں۔

احمد فرازؔ دس سال تک پشاور یونیورسٹی میں لیکچر دیتے رہے۔ اس کے بعد وہ ڈائریکٹر پاکستان نیشنل سینٹر رہے۔

۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۸ء کے عرصے کے دوران انہوں نے ڈائریکٹر جنرل پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے عہدے پر خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد ایک سال کے لئے اس اکیڈمی کے چیئرمین منتخب ہوگئے۔ چیف ایگزیکٹو لوک ورثہ کی خدمات کا عرصہ تین سال پر محیط ہے۔ ان کی آخری سرکاری خدمت ایم ڈی نیشنل بک فاؤنڈیشن ہے۔ یہ کام انہوں نے چھ سال تک سرانجام دیا۔

آپ کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں کراچی یونیورسٹی نے آپ کو ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا، اور آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اکادمی ادبیات پاکستان نے آپ کو آنریری لائف فیلوشپ دی۔

بلاشبہ احمد فرازؔ کی شخصیت کا سحر اپنے عہد کی شاعری پر ایک گہرا تاثر چھوڑ گیا۔ اور یہ تاثر ختم ہونے میں شاید صدیاں بیت جائیں۔ شاید اسی لئے احمد ندیم قاسمیؔ صاحب نے کہا۔

''احمد فرازؔ غزل اور نظم کا ایسا شاعر ہے، جس کا شمار دورِ حاضر کے چند گنے چُنے معتبر ترین شعراء میں ہوتا ہے''۔ بے شک احمد فرازؔ کی غزل اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک الگ باب کی متقاضی ہے۔

کون تولے گا اب ہیروں میں تُمہارے آنسو فرازؔ
وہ جو اِک درد کا تاجر تھا شہر ہی چھوڑ گیا

رانا محمد راشدؔ قمر کے نام

سید عروج اختر (بی بی اے۔۷)

ہائے وہ ساعتِ زیاں جس میں
تیرا چہرہ سپردِ خاک ہوا
اور تجھ سے بچھڑ کے خاک بسر
ہم سپردِ فراق لوٹ پڑے
تیری یادوں کی تعزیت اوڑھے
ساری شامیں غروبِ جاں ٹھہریں
سوچتا ہوں تیری زیارت کی
جا بجا جس نظر کو عادت ہے
وہ تیرے بعد کس کو دیکھے گی؟
تیرے کاغذ، قلم، کتابوں کو
کون اذنِ کلام بخشے گا؟
طاقِ دستک پہ آنے والوں کو
کون لمسِ خرام بخشے گا؟
فکر کے مکتبِ معلیٰ میں
کون قُفلِ لُغات کھولے گا؟
آج کے بعد کس کی غزلوں میں
ہجر گونجیں گے، وصل بولے گا؟
اب بھلا کس سے گفتگو کے لئے
ہم کو لہجہ سنوارنا ہوگا؟

اتنی زندہ تھی زندگی تیری
جس کی دھڑکن سے موت مرتی تھی!
ٹوکنے سے تیرے تکلم کو
خاموشی کی زبان ڈرتی تھی
جانے کس کی نظر لگی تجھ کو!!
سوچتا ہوں کہ کتنی حسرت سے
ہجر کی بے چراغ ساعت میں
تیرے پیکر کی چاندنگری کو
روح نے الوداع کیا ہوگا!!!
تیری نبضوں کی موج تھمنے پر
موت کی آنکھ جھک گئی ہوگی
تیری آنکھیں غروب ہونے پر
وقت کی سانس رک گئی ہوگی
یہ تو اس کی مشیتیں جانیں!!!
چاہتوں سے بچھڑ کے ہم کیسے
اپنی اجڑی صدی میں زندہ ہیں!!!
لوٹ کے آ میرے رانا راشدؔ
ہم کہ نہ فگار پھرتے ہیں!!!!



رانا محمد راشد قمر کی یاد میں

سید شمس الحسن (مدیر): ابھی تو کلی نے مُسکرانا ہی سیکھا تھا، پر شاید اس کلی کو بہار راس نہ آئی اور بہار کے اوائل میں ہی قادرِ مطلق کی مُصلحت آڑے آ گئی۔ راشد سے میری نسبت صرف میگزین کی حد تک ہی نہیں تھی، بلکہ اکثر و بیشتر کھیل کے میدان میں بھی اُس سے واسطہ پڑتا تھا۔ ہمیشہ دلجمعی، ایمانداری اور پھرتی سے کام نمٹانے کی کوشش کرتا ابھی شاید اور بھی کام کرنے تھے اُسے لیکن۔۔۔ ہائے مُصلحتِ ایزدی!

شہریار امتیاز (مدیر): بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اتنی جلدی بے لوث مدد کو تیار ہو جاتے ہیں۔ راشد بھائی اُن میں سے ایک تھے۔

سید نبیل حسن (مدیرِ اعلیٰ): جب میں راشد کے بارے میں سوچتا ہوں تو مُجھے ایک علیحدہ قسم کا شخص دِکھتا ہے۔ جس کا اپنا ایک اندازِ فکر ہے۔ جس کے اپنے کُچھ اصول ہیں، اور وہ اِن اصولوں پر کاربند بھی ہے۔ لیکن شاید ہمارا معاشرہ ابھی تک فِکر و اصول جیسے روایات شکن عناصر کو قبول کرنے کا متحمل نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بونوں کی بستی میں اگر کوئی بڑا آدمی پیدا ہو بھی جائے تو زیادہ جی نہیں پاتا۔۔۔ بہر صورت راشد کی وفات ہمارے دلوں میں ایسا گھاؤ کر گئی ہے جو یاد کے دریا سوکھنے اور حیات کے تار ٹوٹنے تک کبھی مُندمل نہیں ہو سکتا!

راجہ محمد حسیب (مدیر): یہ دوست بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ دینے پر آئیں تو جان دیدیں، لینے پر آئیں تو ہنسی تک چھین لیں، کہنے پر آئیں تو دل کے تمام خانوں کے راز تک کہہ دیں، چھپانے پر آئیں تو یہ تک نہ بتائیں کہ خفا کس بات پر ہیں، ناراض ہونے پر آئیں تو سانس تک نہ لینے دیں، منانے پر آئیں تو اپنی سانسوں کو وار دیں۔ بس دوستی زندگی میں نہیں بلکہ زندگی دوستوں میں ملتی ہے۔ راشد ایسے دوستوں میں سے ہی ایک تھا۔ مِس یو راشد

کرن نذر (مدیرہ): اِس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ کوئی اتنا کم عُمر اور زندگی سے بھرپور شخص ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ اللہ اس کے گھر والوں اور عزیز و اقارب کو اِن مُشکل لمحات میں صبر عطا فرمائے۔ آمین

مبشر احسن (مدیر):

بچھڑا کُچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

کُچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو تا عمر بھُلایا نہیں جا سکتا۔ راشد ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

(القرآن)

اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لیے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ وہ نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔ (الانبیاء-۷۳)



THE YEARLY SYNERGY ....

سعی
اسلام آباد

سی آئی آئی ٹی اسلام آباد

شمارۂ-چہارم ☆☆☆☆

جلد۴ | شمارۂ چہارم ، دسمبر ۲۰۰۷ء تا دسمبر ۲۰۰۸ء، کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی

دانشور لوگ اپنی قوم کے لئے گوہر نایاب ہوتے ہیں اور ملت اپنے اس اثاثے پر نازاں ہوتی ہے

اقبال کی برسی پر بزمِ اقبال کے زیرِ اہتمام تقریب

اقبالؒ کے خیالات وافکار کو نوجوان نسل تک پہنچانے کے لئے کامسیٹس کے طلباء اور اساتذہ نے "بزم اقبال" سوسائٹی کی بنیاد رکھی

سوسائٹی کا مقصد اقبال کی فلسفیانہ شاعری' فلسفۂ حیات اور اقبال کے پیغام کو ہماری آج کی نوجوان نسل کی رگوں میں اتارنا تھا

اسلام آباد (سعی)۔ بزم اقبال سوسائٹی نے ۲۱ اپریل ۲۰۰۸ء کو اقبال کی برسی کے موقع پر باقاعدہ اپنی پہلی بزم سجائی جس میں تمام ڈیپارٹمنٹس کے طلباء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر احسان اکبر تھے۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ایک طلبہ نے حمد پڑھی جس کے بعد تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ طلباء نے گروپس کی شکل میں اقبال کی مشہور تصانیف "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کو ایک مخصوص انداز سے پڑھا جسے سب نے خوب سراہا۔ اس کے بعد چند طلباء نے اپنی پرسوز آواز میں کلام اقبال کو گایا اور موسیقی کے ذریعے اقبال" کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مہمان خصوصی نے اقبال کے فلسفے اور شاعری پر جاندار اور معلوماتی لیکچر دیا جس سے تقریب میں بیٹھے سبھی لوگ خوب مستفید ہوئے۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر شاہد خان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور طلباء کی اس کوشش کو خوب سراہا۔ سب سے آخر میں بزم اقبالؒ کے بانی وصدر جناب ڈاکٹر اشرف عطا صاحب نے تقریب سے خطاب کیا۔ انہوں نے سب کو اس بزم کے مقاصد اور مشن سے آگاہ کیا اور خود بھی فکر اقبالؒ پر روشنی ڈالی اور آخر میں مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا اور طلباء کی محنت کو خوب سراہا اور اختتام تقریب کا اعلان کیا۔



بزم اقبال کے زیر اہتمام تقریب میں شریک ناظرین' جبکہ طلباء ، بزم اقبال کے صدر اور مہمان خصوصی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں

کامسیٹس چک شہزاد میں فنِ خطاطی کی ورکشاپ

مشہور خطاط "اُستاد خورشید عالم گوہر" نے طلباء کو اس نفیس فن کی گہرائیوں سے آشنا کیا

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد نے ہمیشہ کی طرح غیر نصابی سرگرمیوں کے قیام کی روایت کو زندہ رکھا۔ اسی سلسلہ میں کامسیٹس کے چک شہزاد کیمپس میں فن خطاطی کی ایک ورکشاپ منعقد کی گئی۔ ۲۰ سے زائد طلباء وطالبات نے اس ورکشاپ میں حصہ لیتے ہوئے مشہور خطاط "اُستاد خورشید عالم گوہر" سے استفادہ حاصل کیا۔ ورکشاپ کے اختتام پر یونیورسٹی میں طلباء کے کام کی نمائش بھی منعقد کی گئی۔

کامسیٹس' چک شہزاد میں نئی انجینیر نگ تجربہ گاہوں کا قیام

کامسیٹس کے شعبۂ الیکٹریکل انجینیر نگ میں "۹" نئی انجینیر نگ کی تجربہ گاہیں قائم کی گئیں

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ اسلام آباد کی دوسری سب سے بڑی یونیورسٹی ہونے کے ناطے یونیورسٹی میں طلباء کو سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے چک شہزاد کیمپس میں "۹" جدید تجربہ گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جن سے طلباء نے بھرپور استفادہ حاصل کیا اور کر رہے ہیں۔

کل پاکستان مقابلہء تقریر ۲۰۰۸ء آئی ایس ٹی، اسلام آباد

کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے طالب علم "سید عروج اختر" نے پہلی پوزیشن حاصل کی



کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے ہونہار طالب علم "سید عروج اختر"

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ انسٹیٹیوٹ آف سپیس ٹیکنالوجی' اسلام آباد میں منعقدہ کل پاکستان مقابلہء تقریر ۲۰۰۸ء میں کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے بی بی اے کے طالب علم "سید عروج اختر" نے کامسیٹس کی نمائندگی کی۔ ان کی شاندار تقریر اور دلچسپ حسن بیان کی بدولت اُن کو مقابلے میں پہلی پوزیشن کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ انسٹیٹیوٹ آف سپیس ٹیکنالوجی' اسلام آباد میں منعقدہ دیگر مقابلہ جات میں بھی کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی' اسلام آباد کے طلباء نے اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے بھرپور انداز میں شرکت کی اور یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ مقابلہء تقریر اور دیگر مقابلہ جات میں مجموعی طور پر کامسیٹس کو تیسری پوزیشن کا حقدار ٹھہرایا گیا۔



کامسیٹس سپر سٹار کے مہمان خصوصی کا طلباء کے ساتھ گروپ فوٹو، دوسری تصویر میں "طلال ہمایوں (کامسیٹس سپر سٹار)" اور "منور نقوی" مہمان خصوصی سے شیلڈ وصول کررہے ہیں، جبکہ ایک طالبہ موسیقی پیش کررہی ہے

سعی ادارتی کمیٹی



سید نجیل حسن	مدیر اعلیٰ
محمد رضا سرگانہ	نائب مدیر اعلیٰ
مبشر احسن	مدیر گرافک ڈیزائنر
راجہ محمد حبیب	مدیر
کنول رانی	مدیر

کامسیٹس، اسلام آباد نے غیر نصابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی روایت برقرار رکھی

مقابلہ موسیقی 'کامسیٹس سپر سٹار' کا انعقاد

کامسیٹس اسلام آباد کیمپس میں منعقدہ مقابلہ موسیقی میں طلباء و طالبات نے بھرپور انداز میں شرکت کی

"طلال ہمایوں" کو اپنی پُر ترنم آواز اور شاندار کارکردگی کی بناء پر "کامسیٹس سپر سٹار" قرار دیا گیا

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی غیر نصابی سرگرمیوں میں طلباء کی شرکت اور ان کی حوصلہ افزائی کی روایت برقرار رکھی۔ کامسیٹس، اسلام آباد کے چک شہزاد کیمپس میں مقابلہ موسیقی "کامسیٹس سپر سٹار" کا آخری مقابلہ منعقد کیا گیا۔ مقابلے سے پہلے یونیورسٹی کے تمام طلباء و طالبات کے آڈیشن لیے گئے، جس کے بعد ۱۲ طلباء کو پسند کیا گیا۔ آخری مقابلے میں مایہ ناز موسیقار و گلوکار نعمان اور رضوان الحق نے جج کے فرائض سنبھالے۔ مقابلہ تین مرحلوں میں منعقد ہوا۔ پہلے مرحلے کے اختتام پر ۱۲ میں سے ۶ طلباء جبکہ دوسرے مرحلے کے اختتام پر صرف تین طلباء مقابلے میں رہ گئے۔ ان تین طلباء میں طلال ہمایوں، منور نقوی اور محمد فیضان شامل تھے۔ مقابلے کے اختتام پر طلال ہمایوں کو ان کی شاندار پرفارمنس، بے مثال موسیقی، اور آواز کی بدولت مقابلے میں کامیاب ٹھہرایا گیا۔ اسی بناء پر ان کو "کامسیٹس سپر سٹار" کا خطاب دیا گیا۔



کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی میں جشن بہاراں میں شریک طلباء

موسیقی، پتنگ بازی اور سٹالز: کامسیٹس میں جشنِ بہاراں

جشنِ بہاراں کی رنگا رنگ تقریبات میں طلباء و طالبات کی شرکت نے بہار کا لُطف دوبالا کر دیا



جشن بہاراں کے موقع پر طلباء بھنگڑا ڈال رہے ہیں

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے ایچ-۸ کیمپس میں طلباء کے موسم بہار سے لطف اندوز ہونے کی خاطر طلباء کے لیے یونیورسٹی میں جشن بہاراں منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر طلباء نے مختلف اقسام کے سٹالز لگائے جن میں "فرنڈز چیل"، "مہندی" اور دیگر چند سٹالز کو طلباء و طالبات نے بھرپور سراہا۔ جشن بہاراں کے موقع پر طلباء نے پتنگ بازی بھی کی جس کو دوسرے طلباء نے بھی انجوائے کیا۔ تقریب کے آخر میں ایک موسیقی کا پروگرام بھی رکھا گیا جس میں کامسیٹس ہی کے شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ کے ریسرچ ایسوسی ایٹ "ذیشان احمد" نے اپنے فن موسیقی کے ذریعے طلباء پر سحر طاری کر دیا۔ طلباء و طالبات نے جشن بہاراں اور خاص طور پر موسیقی کے پروگرام کو خوب سراہا۔



کامسیٹس سپر سٹار کے موقع پر ایک طالبہ موسیقی سے لُطف اندوز ہو رہی ہے۔

کامسیٹس، اسلام آباد کیمپس کے طلباء کا معلوماتی دورہ ایبٹ آباد

طلباء نے کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف آئی ٹی، ایبٹ آباد کے شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ کا دورہ کیا



کامسیٹس، ایبٹ آباد

اسلام آباد (نمائندہ سعی)۔ کامسیٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، اسلام آباد کے شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ کے طلباء نے کامسیٹس، ایبٹ آباد کے شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد کامسیٹس اسلام آباد کے طلباء کو کامسیٹس کے دوسرے کیمپس میں موجود جدید تجربہ گاہ میں موجود آلات اور ان کے استعمال سے آگہی فراہم کرنا تھا۔ طلباء نے اسلام آباد کیمپس کے لیکچرار "داؤد احمد خان" کی سربراہی میں تجربات بھی کیے۔ دورے میں شریک طلباء و طالبات نے اس دورے سے بھرپور استفادہ حاصل کیا۔ مجموعی طور پر طلباء اور دونوں کیمپس کے اساتذہ نے اس معلوماتی دورے کو بھرپور سراہا۔



کامسیٹس اسلام آباد کے طلباء کے دورۂ ایبٹ آباد کے موقع پر طلباء کا گروپ فوٹو

کامسیٹس اور ۲۰۰۸ء، ایک نظر میں



۲۰۰۸ء کے دوران "سعی" ادارتی کمیٹی کی معزز اور ہر دلعزیز کوآرڈینیٹر، محترمہ گلشن زہرہ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئیں



بزم شگفتہ کے موقع پر معزز مہمانانِ گرامی اپنا کلام پیش کر رہے ہیں، جبکہ دوسری تصاویر میں جناب انور مسعود طلباء کے ساتھ ہیں



طلباء وطالبات کی مختلف سرگرمیاں



کامسیٹس کے طلباء وطالبات کی سرگرمیاں










چ۔ش

(چک شہزاد)








محترمہ گُلشن زہرہ (کوآرڈینیٹر ''سعی''): رانا مُحمد راشد قمر اُن چند طلباء میں سے تھا، جنہوں نے ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوایا۔ ہاکی کا میدان ہو یا پھر کوئی مشاعرہ، مقابلہ ٔ تقریر ہو یا مجلسِ ادارت، ہر جگہ راشد نے اپنے آپ کو اول ثابت کیا۔ لیکن شاید بہار میں کھلنے والے خوبصورت پھولوں کی طرح اُس کی قسمت میں بھی ایک مختصر زندگی تھی۔ مختصر مگر خوبصورتی سے بھرپور۔

جناب مظہر حبیب (انچارج ''سعی''): رانا مُحمد راشد قمر نے جس خوبصورتی کے ساتھ ''سعی'' کے گُلشن کی آبیاری کی، اُس کی کمی آج اُس کے جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ راشد کو جب بھی کوئی کام دیا گیا تو اُس نے اس خوش اسلوبی سے اُسے مُکمل کیا کہ شاید ہی کوئی اور کر سکے، بے شک وہ اُن چند گنے چُنے لوگوں میں سے تھا جس کے لیے قسمت خود نئے نئے راستے کھولتی جاتی تھی، لیکن شاید اُسے منزل تک پُہنچنے کی جلدی تھی۔

جناب مہدی عباس (کوآرڈینیٹر ''سعی'' و شعبہ ٔ ای ای): رانا راشد سے میری جان پہچان زمانہ ٔ طالب علمی سے تھی۔ بحیثیت اچھے دوستوں کے ''سعی'' کے شمارہ ۲۰۰۷ء میں ہم نے مِل کر کام کیا۔ اپنے کام کے لیے بے لوث محنت اور ہر مُشکل وقت میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دوستوں کا ساتھ دینا وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ آج بھی قدم قدم پر یاد آتا ہے۔ اللہ اُسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

جناب منشور حُسین (شعبہ مینیجمنٹ سائنسز): رانا راشد ہمارے یونیورسٹی کے ان طالبِ علموں میں سے تھا جو ہر کام میں بھرپور طریقے سے حصّہ لیا کرتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بُہت آسانی سے کسی کو بھی اپنی بات پر قائل کر لیتا تھا۔

خاور نعیم (مدیرِ اعلیٰ، حصہ ٔ انگریزی ''سعی ۲۰۰۷ء''): رانا راشد کی وفات صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ راشد جیسا محنتی، پُر جوش، باہمت اور مُحبت کرنے والا انسان میرا دوست رہا۔ ''سعی'' کے شمارہ ۲۰۰۷ء میں کام کے دوران اُس کے ساتھ گُزرنے والا وقت آج بھی یاد آتا ہے۔

محمد رضا سرگانہ (نائب مدیرِ اعلیٰ): ''مجھے نئے لوگوں کو جاننے اور اُن سے دوستی کرنے کا شوق ہے''۔ دوستی کے لافانی جذبے سے ہر دم سرشار اور اِس ایک جُملے سے جانے کتنوں کو اپنا دوست بنانے والے راشد بھائی ہمارے دلوں میں اپنی دائمی مفارقت کا غم چھوڑ گئے۔

SAICON 2008

1st South Asian International Conference

Globalization & Change: Issues, Concerns & Impact

November 12-14, 2008

Pearl Continental, Bhurban, Murree





4th Edition

SYNERGY

COMSATS

COMSATS Institute of Information Technology, Islamabad